Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ فروری ۲۰۱۷ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۰ ۔ شمارہ نمبر: ۴

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بحیرۂ اسود اور پَر تولتا ہوا روس

Boris Toucas

یہ مضمون دراصل ان مضامین کی سیریز کا آغاز ہے جن کا مقصد امریکا اور نیٹو کے لیے بحیرۂ اسود کی اسٹریٹجک اہمیت کا اندازہ لگانا ہے۔ مارچ ۲۰۱۴ء میں کریمیا کے روس سے الحاق نے دنیا کو ایک بار پھر اس علاقے کی طرف متوجہ کر دیا جو ماضی کی دو عظیم سلطنتوں (روس اور عثمانی دور پر مبنی ترکی) کے درمیان واقع ہے۔ اور ان دونوں سے برطانیہ، فرانس اور جرمنی سمیت کئی یورپی طاقتوں کا بھی اشتراکِ عمل تھا۔ اس تجزیے کا بنیادی مقصد خطے کے حوالے سے ایک مجموعی رائے ظاہر کرنا ہے جو دراصل اس خطے سے تعلق رکھنے والی ماضی کی عظیم طاقتوں کے ارادوں کے حوالے سے ہے۔ یہ طاقتیں جدید دور کے اطوار اپنا کر اس خطے میں اپنی پوزیشن مستحکم تر کرنے کے فراق میں ہیں۔

۱۷۶۸ء اور ۱۷۷۴ء کے دوران روس اور غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی ترک سلطنت کے درمیان مناقشہ رہا جس کے بعد ۱۷۷۴ء میں دونوں کے درمیان کوچوک کینارکا کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے سے روس کو کرچ اور ازووکی بندرگاہوں کے ذریعے بحیرۂ اسود تک براہ راست رسائی ملی۔ روس کو ترکی میں عیسائی اقلیت کو تحفظ فراہم کرنے کا حق بھی ملا۔ اور علامتی طور پر خود مختار کریمین خانیت کو تھوڑے بہت اختیارات کے ساتھ مقرر کیا گیا۔ اس معاہدے کے ۹ سال بعد روس کے حکمراں طبقے کی طرف سے متعارف کرائی جانے والی اصلاحات کے خلاف عوام نے مزاحمت کی۔ دوسری طرف کریمیا کی طرف آبادگاہوں کا بہاؤ جاری تھا۔ اس سے روس کی ملکہ کیتھرین دوم کے ایلچی شہزادہ گریگوری پوٹیمکن کو کریمیا کے روس سے بزور الحاق کا بہانہ مل گیا۔ اسے معمولی سی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی سال یعنی ۱۷۸۳ء میں کریمیا کے دارالحکومت سیواستوپول کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس بڑی تبدیلی سے روس بحیرۂ اسود میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا جبکہ سلطنت عثمانیہ نے زوال کی راہ پر طویل سفر شروع کیا۔

سلطنت عثمانیہ کا انحطاط جاری رہا۔ ساتھ ہی بحیرۂ اسود کے خطے میں علاقائی طاقتوں کے درمیان زیادہ اثر و رسوخ ثابت کرنے کی کشمکش بھی جاری رہی۔ کوئی ایک بھی فریق حتمی اور فیصلہ کن فتح کا دعوٰی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء کے درمیان روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان کریمیا کی جنگ ہوئی جس نے لاکھوں افراد کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ اس تنازع میں برطانیہ اور فرانس نے عثمانیوں کا ساتھ دیا۔ انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ روس کا مزید طاقتور بن کر ابھرنا اس خطے میں اس کی بھرپور بالادستی کے قیام کی راہ ہموار کر دے گا۔ مگر یہ خوف بہت حد تک بلا جواز تھا کیونکہ روس کبھی اس پوزیشن میں نہ آ سکا کہ باسفورس اور آبنائے ترکی پر اپنا بھرپور کنٹرول قائم کر سکے۔ پہلی جنگ عظیم میں روس کی شرکت کا ایک اہم محرک یہ تھا کہ آبنائے ترکی پر کنٹرول قائم کیا جائے، مگر یہ منصوبہ بھی ''بیک فائر'' کر گیا۔ کیونکہ جرمنوں نے ترکوں کے ساتھ مل کر روسیوں کا ناکامی سے دوچار کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اختتام پر روسی اور عثمانی سلطنت زوال سے دوچار ہوئی اور خطے کا جغرافیہ تبدیل کرنے کی کوششیں نئے سرے سے کی گئیں۔ پہلی کوشش ۱۹۲۰ء کا معاہدۂ سیورز تھا اور دوسری، قدرے کامیاب کوشش ۱۹۲۳ء میں لوزان کے امن معاہدے کی صورت میں کی گئی۔ اسی سے ترک جمہوریہ کی راہ ہموار ہوئی۔ ترکی تزویراتی اعتبار سے اچھی پوزیشن میں آ گیا تھا اور اس نے لوزان امن معاہدے کے ذریعے یورپی طاقتوں کو پیغام دیا کہ وہ کسی کی مرضی کے سامنے زیادہ نہیں جھکے گا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۳۶ء کے ''مانٹریکس کنونشن'' نے جنم لیا جس نے آبنائے ترکی پر ترکی کا کنٹرول باضابطہ بنایا اور ساتھ ہی اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ بحیرۂ اسود کے جن ممالک سے ترکی کا کوئی مناقشہ نہیں ان کے جنگی جہاز بحفاظت گزر سکیں۔ بحیرۂ اسود کے خطے سے باہر کے ممالک کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ ایسے جنگی جہاز نہ بھیجیں جن کا وزن ۱۵ ہزار ٹن سے زائد ہو اور مجموعی وزن کی حد ۴۵ ہزار ٹن رکھی گئی۔ اور یہ جہاز بحیرۂ اسود میں ۲۱ دن سے زیادہ نہیں رک سکتے تھے۔ امریکا مانٹریکس کنونشن کا فریق نہیں تھا۔

دوسری عالمی جنگ اور سرد جنگ کے بعد کا نظام

طاقت کا یہ توازن بہت نازک تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر کشیدگی ایک بار پھر جاگ اٹھی۔ سوویت یونین کی

اندرونی صفحات پر:۔

- ترکی: سلطنت عثمانیہ کے بعد کی بڑی تبدیلی
- ٹرمپ کی خارجہ پالیسی
- مقدس مشعل
- لبرل ازم کے خواب
- امریکی داخلی سلامتی کے ''نئے'' وزیر۔ ایک تعارف
- سچائی نہیں، جھوٹ کی دنیا
- سعودی عرب کی ٹرمپ سے توقعات
- متبادل سچ

خواہش تھی کہ ترکی مانٹریکس کنونشن پر نظر ثانی کرے تاکہ علاقے کے پانیوں پر سوویت ریاست کا کنٹرول معقول حد تک قائم ہو سکے۔ ۱۹۴۶ء کے آبنائے ترک بحران میں سوویت یونین نے بحیرۂ اسود میں اپنی عسکری موجودگی بڑھادی تاکہ ترکی میں سوویت فوجی اڈوں کے قیام کا مطالبہ ترک حکومت سے منوایا جاسکے۔ بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث ترکی نے امریکا سے مدد چاہی جس کا جواب امریکا نے فوری اور مثبت دیا یعنی خطے میں جنگی جہاز بھیج دیے۔ سوویت یونین نے پسپائی اختیار مگر یہ مناقشہ ۱۹۴۷ء کی ٹرومین ڈاکٹرائن کی بنیاد بنا، جس کی بنیاد پر سوویت یونین کو کنٹرول کرنے اور ایک خاصے خطے تک محدود رکھنے کے لیے امریکا نے ترکی اور یونان کو ۱۹۵۲ء میں معاہدۂ شمالی بحراوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کی رکنیت دلائی۔ سرد جنگ کے پورے دور میں بحیرۂ اسود کے خطے میں ترکی، نیٹو، امریکا اور سوویت یونین کے درمیان ایک تناؤ بھرا توازن برقرار رہا۔ ۱۹۷۶ء سے ترکی نے سوویت طیارہ بردار جہازوں کو (جو یوکرین میں تیار کیے جاتے تھے) اپنے پانیوں سے گزرنے کی اجازت دی۔

۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد بحیرۂ اسود کا خطہ مغربی طاقتوں کے لیے تزویراتی اعتبار سے پہلا سا اہم نہ رہا، مگر روس کے لیے اس کی اہمیت کی کم نہ ہوئی۔ کیونکہ اُسے بیرونی دنیا سے رابطے کے لیے ان پانیوں کی شدید ضرورت ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کی تحلیل کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یوکرین میں موجود جوہری ہتھیاروں کا خاتمہ تھا۔ ۱۹۹۴ء میں ہنگری کے دارالحکومت بڈاپیسٹ میں مذاکرات کے بعد ایک میمورینڈم پر دستخط کیے گئے۔ جس میں یوکرین نے روس، امریکا اور برطانیہ کی طرف سے سلامتی یقینی بنائے جانے کی ضمانت کے عوض جوہری ہتھیار ختم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ فرانس اور چین نے بھی اس بات کی ضمانت دی کہ وہ یوکرین کی سلامتی اور سالمیت برقرار رکھنے میں معاونت کریں گے۔

پالیسی کے حوالے سے اس بڑی کامیابی کے باوجود جزیرہ نما کریمیا کے معاملے پر روس اور یوکرین میں کشیدگی برقرار رہی۔ زار کے دور کے روس اور یوکرین کے انضمام کے ۳۰۰ سال مکمل ہونے پر ۱۹۵۴ء میں سوویت یونین کے اس وقت کے وزیراعظم نکیتا خروشیف نے جزیرہ نما کریمیا کو تحفے کے طور پر یوکرین کا حصہ بنایا تھا۔ تب سے یہ علاقہ دونوں ممالک کے درمیان ''بارگیننگ چپ'' کا سا درجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ روس نے ملٹری انفرااسٹرکچر برقرار رکھا۔ سیواستوپول کی بندرگاہ میں روس کا فوجی اڈا بھی برقرار رکھا گیا، تاکہ بحیرۂ اسود میں روسی بحری بیڑے کو چلانا ممکن رہے۔ سوویت یونین کی تحلیل کے وقت سیواستوپول میں روس کے ۶۰ فوجی، تکنیکی شعبے اور دیگر امور سے متعلق ایک لاکھ افراد جبکہ ۲۸ آبدوزوں سمیت ۸۳۵ جہاز بحیرۂ اسود میں تھے۔ یہ غیر معمولی عسکری موجودگی سیواستوپول شہر اور اس کے بنیادی ڈھانچے کی قانونی حیثیت کے حوالے سے یوکرین کی حکومت کو دباؤ میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔ جزیرہ نما کریمیا میں روس کے اثرات بہت مضبوط اور نمایاں تھے۔ وہاں قوم پرستی کی لہر موجود تھی جس کا روسی قیادت نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کریمیا نے اپنی خودمختار حیثیت برقرار رکھی اور ۱۹۹۵ء تک اس کا اپنا آئین موجود تھا۔ یہ سب کچھ یوکرین کی قیادت پر دباؤ بڑھانے کے لیے کافی تھا۔ ۱۹۹۷ء میں روس اور یوکرین کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا، جس کے تحت بحیرۂ اسود کے سوویت بحری بیڑے کا ۱۹ فیصد یوکرین کو ملا اور روس کی طرف سے بیشتر قرضے ختم کرنے اور توانائی رعایتی نرخ پر فراہم کرنے کے عوض یوکرین نے سیواستوپول کی بندرگاہ روس کو بیس سالہ لیز پر دے دی۔

نیا روس ابھر رہا ہے!

روس میں یہ تاثر موجود رہا ہے کہ سابق سوویت ریاستوں اور بحیرۂ اسود پر اس کا حق فطری طور پر یعنی جغرافیائی حقیقت کی حیثیت سے زیادہ ہے، مگر اس میں اِتنی سیاسی، معاشی اور عسکری قوت نہ تھی کہ اس تاثر کو حقیقت کا روپ دے سکتا۔ ۰۴-۲۰۰۳ء میں جارجیا کے گلابی انقلاب اور ۰۵-۲۰۰۴ء میں یوکرین کے نارنگی انقلاب کے بعد روس نے بھی علاقائی بالادستی قائم کرنے کے حوالے سے اپنی پالیسی مزید سخت کردی اور اپنی بات منوانے کی طرف زیادہ مائل دکھائی دینے لگا۔ جارجیا اور یوکرین میں روس کی طرف واضح جھکاؤ رکھنے والے قائدین کو بدل دیا گیا اور ان کی جگہ وہ لوگ آئے جو مغرب یا یورو اٹلانٹک کے لیے واضح جھکاؤ رکھتے تھے۔ اُسی وقت یعنی ۲۰۰۴ء میں نیٹو نے بلغاریہ اور رومانیہ کو بھی رکنیت دے دی۔ یوں بحیرۂ اسود سے جڑی ہوئی ۶ ریاستوں میں سے ۳ نیٹو کی رکن ہوگئیں اور باقی ۳ میں سے بھی جارجیا اور یوکرین کو رکنیت دینے کی باتیں کی جانے لگیں۔ نیٹو نے ۲۰۰۸ء کی بخارسٹ سربراہ کانفرنس کے اعلامیے میں کہا کہ یورپ اور اٹلانٹک کے خطے کی سلامتی کے لیے بحیرۂ اسود کے خطے میں معاملات کا درست رہنا لازم ہے۔

روسی قیادت نے نیٹو کی طرف سے کیے جانے والے ان اقدامات کو اپنے اثر ورسوخ کے روایتی خطے میں مداخلت سے تعبیر کیا اور بحیرۂ اسود میں اپنے اثرات بڑھانے کے حوالے سے اقدامات کی راہ ہموار کی۔ ۲۰۰۶ء اور پھر ۲۰۰۹ء میں روس نے یوکرین کو رام کرنے کے لیے توانائی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ روس نے یوکرین کے ذریعے یورپ کو قدرتی گیس کی فراہمی بند کردی۔ اور ساتھ ہی توانائی کے نرخ بھی بڑھادیے۔ اگست ۲۰۰۸ء میں روسی افواج نے، جو ۱۹۹۳ء میں جارجیا اور جنوبی اوسیشیا کے قضیے کے آغاز سے جنوبی اوسیشیا میں موجود تھیں، اس الگ ہوجانے والے خطے کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے جارجیا کے صدر کی کوشش ناکام بنائی اور جارجیا میں داخل ہوئیں، اور جارجیا کی فوج پر قابو پالیا اور دارالحکومت تبلسی پر تقریباً قبضہ کرلیا۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے مجموعی طور پر ۳۵۰ فوجی اور ۴۰۰ سے زائد شہری مارے گئے۔ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے روس نے جنوبی اوسیشیا اور ابخازیہ کی طرف سے آزادی کے اعلان کو شرفِ قبولیت بخشا۔ تب سے اب تک روس نے جارجیا پر اپنا کنٹرول بڑھانے کے اقدامات جاری رکھے ہیں۔ وہ انتظامی طور پر دونوں خودمختار علاقوں (جنوبی اوسیشیا اور ابخازیہ) کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے بھی کوشاں رہا ہے۔

دوسرا، جغرافیائی اور عسکری اعتبار سے گہرے اثرات کا حامل واقعہ مارچ ۲۰۱۴ء میں کریمیا کا روس سے الحاق تھا۔ یہ الحاق یوکرین کے صدر وکٹر یانوکووچ کی، عوامی انقلاب کے نتیجے میں برطرفی کے بعد رونما ہوا۔ بڈاپیسٹ میمورینڈم اور دوسری کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے روس نے جزیرہ نما کریمیا میں دوبارہ عسکری پیش رفت کی اور ساتھ ہی مشرقی یوکرین میں فوجی مداخلت بھی کی، جس کے نتیجے میں اس خطے میں ملٹری ری انفورسمنٹ کی راہ ہموار ہوئی۔ کئی یونٹس کی تعیناتی کے علاوہ اینٹی ایئر اور اینٹی سرفیس میزائل سسٹمز بھی نصب کیے گئے۔ یورپ کے سابق سپریم الائیڈ کمانڈر جنرل فلپ ایم بریڈلو نے ۲۰۱۵ء میں کریمیا کو روس کی طرف سے طاقت کے اظہار کا پلیٹ فارم قرار دیا۔ روس نے کریمیا میں کی جانے والی لشکرکشی کے ساتھ ہی کسی بھی جوابی کارروائی یا بیرونی مداخلت کی صورت میں جوہری ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی بھی دی۔ کریملن کا کہنا تھا کہ کریمیا کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے وہ جوہری ہتھیار نصب کرنے کا حق رکھتا ہے۔

خطے میں روسی عسکری موجودگی کو بھرپور استحکام بخشنے کی آخری صورت تھی، ستمبر ۲۰۱۵ء میں شام میں روسی فوجی مداخلت۔ روس نے سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ بحیرۂ اسود کے بیڑے کے مختلف اجزاء کو متحرک کیا اور دفاعی و جارحانہ میزائل نظام نصب کیے۔ روس اب شام کے علاقے لتاکیہ میں ایئربیس کامیابی سے آپریٹ کر رہا ہے۔ اور تارتوس

میں اپنے بحری اڈے کو توسیع اور تجدید و تزئین نو کے عمل سے گزار رہا ہے تا کہ وہاں بیک وقت ۱۱ جنگی جہازوں کو لنگر انداز رکھا جا سکے۔ روس نے قبرص سے بھی معاہدہ کر رکھا ہے، جس کے تحت وہاں روسی جہاز لنگر انداز کیے جا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ روسی قیادت مصر سے بھی ایک فوجی اڈے کے قیام کے لیے بات چیت کر رہی ہے۔ لیبیا میں بھی فوجی اڈا قائم کرنے کی باتیں سامنے آ رہی تھیں مگر روسی حکام نے انہیں افواہ قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔

بحیرۂ اسود کی تزویراتی اہمیت کی واپسی

انیسویں صدی میں روس ایک بڑی اور بالا دست قوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ سرد جنگ کے زمانے میں روس کی طاقت غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اس میں شکست و ریخت کا عمل بھی شروع ہوا۔ ۱۹۹۱ء کے بعد ایک تھکی ماندی قوت کے طور پر ظاہر ہوا۔ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم میں امریکا اور یورپ کی موجودگی اور عمل دخل گھٹتا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کے لیے روس اب متحرک ہوتا جا رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ کریملن مشرقی بحیرۂ روم میں اپنی موجودگی بڑھانے پر توجہ دے گا یا نہیں۔ کیا وہ کریمیا اور مشرقی یوکرین میں اپنی عسکری موجودگی کو زیادہ تقویت پہنچانا چاہتا ہے؟ اور کیا وہ نیٹو کی موجودگی گھٹانے کے حوالے سے بلغاریہ پر دباؤ ڈالے گا؟ اور کیا وہ ترک پانیوں میں اپنی موجودگی زیادہ مستحکم کرنے کے لیے ترکی سے زیادہ دوستی اور اشتراکِ عمل پر توجہ دے گا؟

۱۸۵۳ء کے بعد سے روس کے لیے بحیرۂ اسود کی تزویراتی اہمیت کے ٹرکات تبدیل نہیں ہوئے۔ پہلے انفرادی حیثیت میں ریاستیں روس کے مقابل رہا کرتی تھیں۔ بعد میں امریکا اور یورپ نے تنظیموں اور اتحادوں کی سطح پر روس کے لیے راستے بند کرنے کی راہ ہموار کی۔ کریمیا عسکری اہمیت کا سب سے بڑا منبع ہے۔ ترکی مرکزی حریف کے طور پر کھڑا ہے اور ترک پانیوں کے ذریعے ہی روس کو اپنی اہمیت منوانی ہے۔ بنیادی مقصد یہ ہے کہ مشرقی بحیرۂ روم میں امریکا اور یورپ کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف ''کاؤنٹر بیلنس'' کے طور پر کام کیا جائے تا کہ وہ مشرقی اور وسطی بحیرۂ کی طرف زیادہ پیش رفت ممکن نہ بنا سکے۔

(Boris Toucas واشنگٹن کے سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل افیئرز کے یورپ پروگرام سے تعلق رکھتے ہیں۔)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"The Geostrategic Importance of the Black Sea Region: A Brief History".
("csis.org". February 2, 2017)

ترکی: سلطنت عثمانیہ کے بعد کی بڑی تبدیلی

ترکی میں انتخابات کے محکمے نے ۱۶ اپریل کو ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا ہے۔ اس ریفرنڈم میں ترک عوام ملک میں پارلیمانی نظام ختم کر کے صدارتی نظام نافذ کرنے سے متعلق فیصلہ دیں گے۔ ایردوان صدارتی نظام کے خواہش مند ہیں۔

خلافت عثمانیہ کا دور ختم ہونے کے بعد وجود میں آنے والی جدید ترک ریاست کے سیاسی نظام میں سب سے بڑی تبدیلی کے لیے یہ ریفرنڈم کرایا جا رہا ہے۔ اس ریفرنڈم میں ترک عوام ملک میں صدارتی نظام نافذ کرنے کے حق اور مخالفت میں ووٹ ڈالیں گے۔

ترک صدر رجب طیب ایردوان ملک میں موجودہ پارلیمانی جمہوری نظام ختم کر کے صدارتی جمہوری نظام قائم کرنے کی خواہش کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ایردوان کا یہاں تک کہنا ہے کہ ترکی کے سیاسی نظام کی مخالفت کرنے والے ترکی کے دشمن ہیں۔

سیاسی تبدیلی کے بعد ترک صدر کو صدارتی حکم نامے جاری کرنے، ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے، وزراء اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کی تقرری کرنے جیسے اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ اس تبدیلی کے بعد ممکنہ طور پر موجودہ صدر ایردوان نیٹو کی رکن اور یورپی یونین میں شمولیت کی خواہاں ریاست کی باگ ڈور ۲۰۲۹ء تک اپنے ہاتھوں میں رکھ سکیں گے۔

ایردوان کے حامیوں کی رائے میں ترکی میں سکیورٹی کی موجودہ صورت حال، عراق اور شام جیسے ہمسایہ ممالک میں عدم استحکام، داعش اور کرد جنگجوؤں سے لاحق خطرات کے تناظر میں سیاسی نظام کی تبدیلی، ملکی استحکام اور بے یقینی کی کیفیت کے خاتمے کی ضامن ہے۔

دوسری جانب مخالفین کو اندیشہ ہے کہ صدارتی نظام سے ملک میں آمریت کا خدشہ ہے۔ ترکی میں ناکام فوجی بغاوت کے بعد سے پہلے ہی ہزاروں عام شہری، اساتذہ، صحافی اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کے ملازمین زیر حراست ہیں۔

ایردوان اس ریفرنڈم میں عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ انہوں نے عوام کو خبردار کیا ہے کہ سیاسی نظام میں تبدیلی نہ لانے کا فائدہ کردستان ورکرز پارٹی (پی کے کے) سمیت دیگر ملک دشمن قوتوں کو پہنچے گا۔ حکومت کے حامی ایک تھنک ٹینک کے زیر اہتمام ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایردوان کا کہنا تھا، ''سیاسی تبدیلی کی مخالفت کون کر رہا ہے؟ پی کے کے مخالفت کر رہی ہے۔ وہ لوگ جو اس ملک کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں، وہ مخالفت کر رہے ہیں اور وہ لوگ مخالفت کر رہے ہیں جو ترک قومی پرچم کے خلاف ہیں''۔

ایردوان کا کہنا تھا کہ موجودہ پارلیمانی نظام ناکام ہو چکا ہے اور گزشتہ ۹۳ برسوں کے دوران جدید ترک جمہوریہ میں ۶۵ حکومتیں بنیں۔ اوسطاً ایک حکومت صرف ۱۶ مہینے قائم رہی۔

ترکی میں اپوزیشن کی دو بڑی سیاسی جماعتیں، سی ایچ پی اور ایچ ڈی پی سیاسی نظام میں تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس تبدیلی سے ملک میں طاقت کا توازن ختم ہو جائے گا اور پہلے ہی سے طاقتور ایردوان کا اثر و رسوخ مزید بڑھ جائے گا۔

ایردوان کی ہر تقریر کی طرح گزشتہ روز کی گئی تقریر کو بھی ملک کے تقریباً سبھی نشریاتی اداروں نے براہ راست نشر کیا۔ سی ایچ پی کے سربراہ نے انقرہ میں صحافیوں سے کی گئی اپنی ایک گفتگو میں کہا، ''یہ ریفرنڈم شفاف طریقے سے نہیں ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایردوان کا حامی میڈیا اپوزیشن جماعتوں کا موقف عوام تک نہیں پہنچائے گا اور عوام کو یہ تاثر دیا جائے گا کہ ہم ریاست کے خلاف سرگرم ہیں''۔

ترک اخبار 'جمہوریت' کے مطابق اپوزیشن جماعت ایم ایچ پی کی ایک اہم خاتون سیاست دان میرائل اکشنر ہفتے کے روز اپنے حامیوں سے خطاب کرنے لگیں تو ہوٹل کی انتظامیہ نے، جو ایردوان کی حامی تھی، بجلی بند کر دی جس کے باعث اکشنر کو میگا فون کے ذریعے اپنے حامیوں سے خطاب کرنا پڑا۔

(بحوالہ: ''ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام''۔ ۱۲ فروری ۲۰۱۷ء)

بقیہ: امریکی داخلی سلامتی کے ''نئے'' وزیر۔ ایک تعارف

جون کیلی نے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے سات مسلمان ملکوں کے باشندوں کے امریکا میں داخلے پر پابندی کے ایگزیکٹو آرڈر کی غیر مشروط حمایت کی۔ جون کیلی کا کہنا ہے کہ امریکا میں مستقل طور پر بسنے والے شہریوں کی آمد و رفت اور قیام قانونی ہے مگر پناہ گزینوں اور مشکوک افراد کی روک تھام کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے پابندی کا فیصلہ امریکا کے مفاد میں ہے۔

(بحوالہ: ''العربیہ ڈاٹ نیٹ''۔ یکم فروری ۲۰۱۷ء)

ٹرمپ کی خارجہ پالیسی

Ian Bremmer

گزشتہ برس دنیا نے بہت تیزی سے کروٹ بدلی ہے بریگزٹ اور ٹرمپ کے علاوہ بھی دنیا کو حیرت کا ایک اور جھٹکا تب لگا جب ولادیمیر پیوٹن اور رجب طیب ایردوان ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد روس کے بارے میں یہ قیاس آرائیاں کی جاری تھیں کہ روس مغربی ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا، اس وقت مغربی ممالک کے پاس نئی تہذیب نئے خیالات، حوصلہ مند افراد اور جدید ذرائع موجود تھے اور مغربی دنیا کے ساتھ روس ایک اچھے سفر کا آغاز کرسکتا تھا، لیکن ۹۰ کی تباہ کن دہائی کے اختتام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ روس ایک نیا راستہ اختیار کرے گا۔ پیوٹن نے اقتدار کے آغاز ہی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ کرکے دنیا کو سخت اور جارحانہ پیغام دیا۔

گزشتہ برسوں میں ترکی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے، یورپ نے ترکی کو دنیا کی ترقی یافتہ اقوام ''یورپین یونین'' میں شمولیت کے لیے مذاکرات کی دعوت دی تو ترکی نے روس کا طریقہ اختیار ہوئے اس سے انکار کردیا اور سلطنت عثمانیہ کا خواب ترک کرکے صرف ترک ریاست کی ترویج کی۔ روس اور ترکی نے پرزور لفظوں میں دنیا کو یہ پیغام دیا کہ وہ جیسے ہیں انہیں اسی طرح قبول کیا جائے۔

امریکا اور یورپ کے سربراہوں کی قیاس آرائیاں روس اور ترکی کے بارے میں غلط ثابت ہوئیں۔ روس اور ترکی نے مغرب کو مایوس کیا ہے، لیکن ٹرمپ ماضی کے مغربی سربراہوں سے مختلف مزاج رکھتا ہے۔ وہ پیوٹن اور ایردوان کی مغربی اشرافیہ اور مغربی ناقدین سے علیحدگی کی وجوہات جانتا ہے، یہ دونوں آزادانہ اور خودمختارانہ مزاج رکھتے ہیں اور اپنے اقتدار میں کسی کی بھی شراکت برداشت نہیں کرتے۔ ٹرمپ نے انہیں اسی طرح قبول کیا ہے جیسا وہ چاہتے ہیں، وہ اپنے مفاد کے لیے ان دونوں سے تعاون کریں گے اور روس اور ترکی کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔

روس اور ترکی ہمسایہ ممالک ہیں، لیکن وہ فطری اتحادی نہیں بن سکتے۔ جنوری میں تشکیل پانے والا دونوں ممالک کا اتحاد انتہائی غیر متوقع ہے۔ ایک طرف شام کے مسئلے پر روس ترکی کی مدد کررہا ہے تو دوسری طرف روس ترکی کے ذریعے بحیرۂ اسود سے بحیرۂ روم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ترکی ناٹو کا اتحادی ہے اور ناٹو ممالک سویت یونین کی شکست کی علامت ہیں۔ ترکی اور روس ماضی میں عظیم سلطنتوں کے مراکز رہے ہیں اور دونوں آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں، ایک بار پھر ان کا ملک عظیم سلطنت کے طور پر دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ ان ریاستوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے۔

رجب طیب ایردوان اور پیوٹن مضبوط ارادے والے انا پرست اور طاقتور انسان ہیں، جو اپنے ملک میں پائیدار سیاسی مستقبل تلاش کررہے ہیں۔ پیوٹن نے مضبوط سیاسی مستقبل کو یقینی بنالیا ہے لیکن ایردوان اس سال ایک ایسا ریفرنڈم کروانے جارہے ہیں جو آئین میں ترمیم کی اجازت دے گا اور ان کے سیاسی مستقبل کو مضبوط اور پائیدار بنائے گا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اگر دوسرے کے مفادات یا اقتدار کے خلاف کچھ بھی کیا تو ایک بار پھر توہین آمیز بیانات اور دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ یہ دونوں ممالک اس وقت تک عارضی اتحادی رہیں گے جب تک یہ ایک دوسرے کے مفادات کے لیے کام کرتے رہیں گے۔

نومبر ۲۰۱۵ء میں روس نے ترکی کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی اور اس کے انتباہ کو نظرانداز کرتے ہوئے شام پر بمباری کی، جس کے جواب میں ترکی نے روس کے طیارہ کو نشانہ بنایا اور روسی پائلٹ کو ہلاک کرکے یہ واضح کردیا کہ ترکی بے وقوف نہیں ہے اور نہ ہی وہ ترنوالہ ہے۔ روس نے ترکی پر پابندیاں عائد کیں اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ ایک ماہ بعد ہی ترکی میں ایردوان کے لیے مصیبتیں کھڑی ہوگئیں۔ فوج کی ناکام بغاوت کے بعد ایردوان نے ہنگامی حالت کا اعلان کردیا اور باغیوں کے خلاف کارروائی کا آغاز کردیا۔ باغیوں کے خلاف کارروائی پر امریکا اور یورپ نے شدید تنقید کی جبکہ روس نے فوجی بغاوت پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ ایردوان نے امریکا اور یورپ کی تنقید کو مسترد کردیا اور روس کو مثبت انداز میں جواب دیا۔ ایردوان کی یہ خواہش رہی ہے کہ روس شام میں کردوں کے خلاف کارروائی کرے، اسی خواہش کے پیش نظر ایردوان نے روسی طیارہ کی تباہی پر یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ روسی طیارہ کی تباہی فوجی باغیوں کی کارروائی تھی۔ اب روس اور ترکی ایک دوسرے کے دوست اور اتحادی ہیں۔ حالیہ دنوں میں ترکی میں روسی سفیر کی ہلاکت بھی اس دوستانہ تعلق پر اثر انداز نہیں ہوسکی اور دونوں ممالک نے اس واقعے کی مذمت کرنے پر اکتفا کیا۔

ٹرمپ کی بین الاقوامی سیاست میں آمد سے پہلے ہی دنیا ایردوان اور پیوٹن کی اشتعال انگیز قیادت سے متعارف تھی۔ ٹرمپ، ایردوان اور پیوٹن کا عکس ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک جیسے مزاج، ایک جیسی انا نیت اور ایک جیسی استعداد کے حامل یہ تینوں صدور مملکت ایک مضبوط گروپ کی شکل اختیار کرلیں اور آپس میں کاروباری انداز میں اپنے مفادات کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

ٹرمپ ان امریکی ووٹروں کو بالکل اہمیت نہیں دیتے جو بین الاقوامی مفاد کی وجہ سے شام میں خانہ جنگی برقرار رکھنا چاہتے ہیں، ٹرمپ کا ہدف داعش کا مکمل خاتمہ ہے اور ٹرمپ یہ چاہتے ہیں کہ امریکا کے لیے خطرہ بننے والی قوتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا جائے۔ ٹرمپ کو اس بات سے کوئی پریشانی نہیں کہ کردوں پر روسی بمباری کے عوض ترکی بشارالاسد کی مخالفت ترک کردے ٹرمپ کے نزدیک یہ ایک اچھا سودا ہے۔

ٹرمپ نے یہ واضح کردیا ہے کہ امریکا اب دنیا کے پولیس مین کا کردار ادا نہیں کرے گا۔ امریکا اب صرف اور صرف اپنے مفاد میں فیصلے کرے گا، ٹرمپ کے پیش نظر صرف امریکا کی ترقی اور امریکی عوام کی خدمت ہے، ٹرمپ کے مطابق وہ لوگ بے وقوف ہیں جو بین الاقوامی قوانین کا خیال کرتے ہیں اور پوری دنیا کے لیے یہ ایک بالکل نئی طرز کی حکومت ہے۔

ٹرمپ متعصب سوچ رکھتے ہیں لیکن وہ تنہائی پسند نہیں ہیں۔ وہ پیوٹن اور ایردوان کی طرح معاملات کو چلنے دیتے ہیں، اور صرف وہیں مداخلت کرتے ہیں جہاں انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے، ٹرمپ فطری انداز میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ٹرمپ کے مطابق روایات اور اصولوں کی پاسداری اس وقت کرنی چاہیے جب یہ آپ کے مفاد میں ہوں۔ ۱۱ جنوری کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ٹرمپ نے کہا کہ اگر پیوٹن مجھے پسند کرتا ہے تو اس میں بُرا کچھ بھی نہیں جس کی جوابدہی کی جائے، بلکہ پیوٹن کی پسندیدگی امریکا کے مفاد میں بہترین ہے۔

یورپ ٹرمپ کے جرأت مندانہ اور سخت گیر بیانات سے پریشان ہے، کوئی بھی یورپی رہنما اس قسم کے بیانات نہیں دیتا، ٹرمپ اگر یورپ کے فیصلوں کی مخالفت کریں گے تو یورپ روس پر عائد پابندیاں نرم کردے گا، لیکن پیوٹن یورپ کے لیے کبھی بھی ایک اچھے دوست نہیں بن سکتے اور نہ ہی یورپ کریمیا کو روس کا مستقل حصہ تسلیم کرے گا۔ شام کے پناہ گزینوں کے

سیلاب کو روکنے کے لیے یورپ ترکی کو فنڈ دے رہا ہے لیکن یورپ، ترکی میں حزب اختلاف اور صحافیوں کی گرفتاری اور پھانسی کی سزا کی بحالی کی کبھی حمایت نہیں کرے گا۔

ٹرمپ ان معاملات کی پرواہ نہیں کرتے، یوکرائن کے معاملات سے وہ الگ تھلگ ہیں، الاسکا اور روس کے الحاق کا انہیں خوف نہیں ہے، اسے شمالی کیرالائنا کے بیرونی کنارے پر شامی مہاجرین کی ہلاکتوں کی فکر نہیں، ٹرمپ کے لیے یہ سب کچھ امریکی مفاد کا حصہ ہے اور وہ کبھی بھی ان معاملات پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کریں گے۔

لبرل اشرافیہ پر یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ سرد جنگ کی فتح اور لبرل سوچ کے تحت دنیا کی سیاست کے بارے میں کی گئی پیشگوئیوں کا دور کب کا ختم ہو چکا ہے۔ دنیا کا واحد سپر پاور اپنے مفادات کی بنیاد پر اپنی انانیت پسندی کے ساتھ من پسند سودے کرے گا اور ان ممالک کے ساتھ شراکت داری کرے گا جو اس کے مفادات کے لیے بہترین ہوں گے۔ واشنگٹن میں موجود مقتدر اشرافیہ کو اب یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ امریکا بدل چکا ہے۔

ممکن ہے کہ انانیت پسندی اور مشترکہ مفادات روس ترکی اور امریکا کو قریب کر دیں اور ہو سکتا ہے کہ یہی چیز انہیں ایک دوسرے سے دور کر دے۔ مستقبل میں ان کے تعلقات آپس کے لین دین اور مشترکہ مفادات کی بنیاد پر ہوں گے۔ مشترکہ اقدار، اعتماد اور بھروسے جیسی اصطلاحات اب تعلقات بنانے کے لیے ناکافی ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات اور حکومتوں کا اتحاد اب تجارتی اور مشترکہ مفادات کی بنیاد پر ہی تشکیل پائے گا۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

("Donald Trump's New World Order Puts Nation Over Globe". "Time Magazine ". Jan. 12, 2017)

بقیہ: مستقبل کی افغان ریاست اور طالبان

ملا عبدالسلام ضعیف نے بتایا کہ وہ جب احمد شاہ مسعود سے ملاقات کے لیے روانہ ہو رہے تھے تب طالبان کے امیر ملا عمر نے کہا کہ فوج کی تشکیل اور اس کے کنٹرول جیسے اہم معاملات میں احمد شاہ مسعود کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خیال میں ایسا کرنا مسائل کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دے گا۔ احمد شاہ مسعود کا کہنا تھا کہ سوویت افواج کو ملک سے نکالنے میں انہوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اس لیے فوج کی تشکیل جیسے اہم معاملے میں انہیں بھی شریک کیا جانا چاہیے۔ طالبان قیادت نہ مانی اور بات نہ بن سکی۔ ملا عمر اس موقف سے ہٹنے کو تیار نہ ہوئے کہ جامع اور مستعد فوج کے لیے واحد اور متفقہ کمانڈ کی ضرورت ہے۔

مقدس مشعل

اے کے بروہی

اس تقریب میں خیالات کا رُخ لازماً اس سوال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ اس جدید دور میں ادیب کس صورتحال سے دوچار ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ کو ان سوچوں میں شریک کروں جو میرے دل و دماغ پر اس سے طاری ہوتی ہیں، جب میرا دھیان جدید دور میں صاحب قلم کے کردار کی طرف جاتا ہے، میں اس موقع پر صاحبِ قلم کی صلاحیت اور اس کی ذمہ داری کے متعلق گزارشات پیش کروں گا۔ میں ان محرکات کا بھی ذکر کروں گا، جو ادیب کی تخلیقی صلاحیت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان دکھوں کا بھی ذکر کروں گا جن کے چرکے صاحبِ قلم اس تنگ نظر اور بانجھ عہد میں کھا رہے ہیں، جس میں ہم رہتے ہیں۔ اگر آپ ٹھنڈے دل سے انسانی تاریخ کے بہاؤ پر غور کریں اور ان بنیادی قوتوں کے بارے میں سوچیں جنہوں نے اس تاریخ کی تشکیل کی اور اسے فیصلہ کن صلاحیت عطا کی، جس نے آدمی کو آدمی کہلانے کا سزاوار بنایا تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انسانیت کی قسمتوں کے فیصلے ہمیشہ چند عظیم انسانوں نے کیے ہیں جو انسانیت ہی کی کوکھ سے پیدا ہوئے اور یہ ضرب المثل تو بہت پرانی ہے کہ چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو اس کرّہ ارضی کا سنگار کہلاتے ہیں۔

انسانی تاریخ کے عظیم ترین ہیرو وہ پیغمبر ہیں جو اس کائنات کی تاریخ میں الوہی روشنی کی کرنیں لے کر آئے اور جنہوں نے انسانیت کو زندگی کا راز آشنا بنانے میں بے پناہ مدد دی۔ وہ بلند آدرش بھی دیے جو زندگی کے ظالم کھیل میں ہمارے بچاؤ کی صورت پیدا کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پیغمبر انسانیت کے حقیقی معلم ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ایک عام انسان کے لیے اپنے وجود کی ماہیت اور مقصد کو سمجھنا اور اپنی تکمیل کے لیے الوہیت (ایک سچا ادیب دراصل ایک سعی مجسم ہے خواہ اس کی سعی کا دنیا اعتراف کرے یا نہ کرے، ایک سچا ادیب سراپا تقدس ہے وہ کائنات کا اجالا ہے، وہ مقدس مشعل تھامے وقت کے ایک خرابے میں کائنات کا میر سفر ہے) کی طرف بڑھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ لطافت و رعنائی اور روشن خیالی کی شعاعوں کا منبع صرف وہی ایک ذات ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا اور ہمیں بندگی بجا لانے کا فرض سونپا، ان پیغمبروں کی تعلیمات انسانیت کے عظیم مذاہب کے آسمانی صحیفوں میں ملتی ہیں۔ صحائفِ آسمانی سے مسلسل تعلق روحانی فیضان و ہدایت حیرت و استعجاب اور امید و انبساط کا لازوال سرمایہ عطا کرتا ہے۔

میرے نزدیک مذہبی سچائیاں ایک ایسی عدالت عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں جو اس راہِ ہدایت کا تعین کرتی ہے جس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شخصیت کو آزادانہ ارتقا کا موقع ملتا ہے اور فرد زندگی کی بڑی اسکیم میں خواہ وہ قومی ریاست کی بنیاد پر ہو یا انسانی برادری کے وسیع تصور پر اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ مذہبی صداقتوں سے بے تعلق ہو کر اور صرف ظن و تخمین کے سہارے مذہبی تعلیمات سے آگے جا سکے جو کوئی ان حقیقتوں اور تعلیمات کو جھٹلانا چاہتا ہے وہ دراصل خدا کی حاکمیت کا منکر ہے اور اس قانون سے نبرد آزما ہے جس کے نظم میں تمام کائنات جکڑی ہوئی ہے۔

ادیب کا منصب

پیغمبروں کے بعد وہ لوگ آتے ہیں جنہیں کارلائل نے انسانیت کے مرشد کہا ہے، یعنی وہ لوگ جو کتابیں لکھتے ہیں۔ ان اہل علم کا کام بشرطیکہ وہ اپنے نام کی آبرو قائم رکھنے والے ہوں کسی نئی صداقت کا اظہار کرنے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ اپنے عصری تقاضوں کے مطابق ان سچائیوں کو پیرایہ اظہار بخشیں جو انبیائے کرام پہلے ہی انسانیت تک پہنچا چکے ہیں۔ جب انسانیت کا مذہبی ارتقا پیغمبر آخر الزماں کی تعلیمات میں سمٹ آیا تو وحی کا دور ختم ہو گیا۔ اگر کائناتی تاریخ کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے عہد کو عمل پذیری کا دور کہا جا سکتا ہے، وہ اس لیے کہ اب تک انسانیت کے مذہبی معلمین تک جو کچھ پہنچایا گیا تھا اس کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانا تھا اور یہ مذہبی تعلیم، انسان اور اشیا اور انسان کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ مذہبی سچائی جو پہاڑوں کی طرح اٹل اور قدیم ہے ہر مقام اور دَور میں معاشرے کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے تقاضوں کے مطابق نیا پیرایہ اظہار اختیار کرتی رہے اور فرد بہرحال اس عمل کا ایک لاینفک جزو ہے۔ ہر اس ادیب کے لیے جو کارلائل کے ادیب سے، جسے اس نے انسانیت کا مرشد کہا ہے ہم آہنگ ہونے کا آرزومند ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ

ان بنیادی مذہبی سچائیوں کو پیش کرنے کا مقدس فرض ہمہ وقت بجالاتا رہے جن کا ان کی زندگی اور اس کی منزل مقصود سے گہرا تعلق ہے اور جو روزمرہ کے برتاؤ میں ذوق وشوق کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ کارلائل، ماورائی فلسفے سے بہت متاثر تھا۔ اس فلسفے کی تعلیم یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی کی وہ تمام اشیا جو ہم دیکھتے ہیں اور جن کے ساتھ ہم زندگی بسر کرتے ہیں (ان اشیا میں لازمی طور پر ہم اور ہمارے اردگرد کے تمام لوگ بھی شامل ہیں) ایک قسم کا حیاتی وجود رکھتی ہیں اور ان ظاہری پردوں کے پیچھے کائنات کے الوہی تصور کی روشنی چھپی ہوتی ہے۔ یہی وہ تصورِ الوہی ہے جو ان تمام ظواہر کا جوہر ہے۔ عام لوگوں کے لیے اس الوہی تصور کا ادراک بہت مشکل ہے۔ وہ اپنی روزمرہ کی حیاتیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ نہ تو ان کے پاس اتنا وقت ہے اور نہ ہی ان میں اتنی صلاحیت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ رازِ تحقیق سمجھ سکیں اور یوں ظاہری پردوں کو چیر کر اس مقام تک دیکھ سکیں جہاں وہ الوہی تصور روشنی بن کر پھیلا ہوا ہے۔ ایک عظیم ادیب ہمارے کائناتی تجربے کی ہمارے سامنے ایسی تشریح کرتا ہے کہ اس کا پنہاں الوہی پہلو ہمارے سامنے نمایاں ہوجاتا ہے۔ کارلائل نے ادیب کے اس منصب کو ان لافانی لفظوں میں بیان کیا ہے: ''اہل قلم مرشدوں کا وہ سلسلہ ہیں جو عہد بہ عہد چلتا ہے۔ یہ تمام انسانوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ خدا تمہاری زندگیوں میں موجود ہے اور یہ تمام ظواہر جو ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کائنات کے الوہی تصور کا مظہر ہیں۔ لہٰذا ایک سچا ادیب دراصل ایک سعی مجسم ہے، خواہ اس سعی کا دنیا اعتراف کرے یا نہ کرے (اس سے بھی بڑھ کر) ایک سچا ادیب سراپا تقدس ہے، وہ کائنات کا اجالا ہے۔ وہ مقدس مشعل تھامے وقت کے ایک خرابے میں کائنات کا میر سفر ہے''۔

لکھنا اب روز کے معمولات میں ہے!

موجودہ دور میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر ایسے ادیبوں کا ملنا مشکل ہے جو اس معیار پر پورے اترتے ہوں، اب لکھنے کے تخلیقی عمل کو بھی تجارت بنا دیا گیا ہے، گزارا چلانے کا ایک ذریعہ۔ اب ادیب لکھتے ہیں اس لیے نہیں کہ ان کو اپنے بھرپور جذبات کا اظہار کرنا ہے، بلکہ اپنی خالی جیب بھرنے کے لیے۔ یہ لفاظی کا دور ہے، صرف لفاظی کا، اور افسوس! ایسی لفاظی کا جس کا کوئی واضح مطلب نہیں نکلتا۔ ذرا دیکھیے کہ ساری دنیا میں چھپے ہوئے الفاظ کا کیسا طوفان ابل رہا ہے۔ اَن گنت کتابیں، رسالے، اخبار، جرائد اور کیا کچھ نہیں، لیکن لفظوں کے اس دریا کے طوفانی بہاؤ کے باوجود انسانیت کوئی ایسا وجدانی بول سننے کو ترس رہی ہے جو کسی عظیم روح کے ذہنی سفر کا سنگ میل ہو، لکھنا ایک تجارت ہے جو کام محض سکے کمانا ہے۔ انسانوں کی روحوں کو جیتنا نہیں، اشاعت وابلاغ کے میدان میں وہ جنگجو جنہوں نے واقعی کسی بلند مقصد کا حصول اپنے پیش نظر رکھا ہو، تعداد میں اتنے کم ہیں کہ ان کو پہچاننا تقریباً ناممکن ہے۔ آج کی دنیا میں چھپے ہوئے الفاظ کے بے پناہ انبار میں کسی قابل توجہ چیز کا انتخاب روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے۔ انتخاب کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ ہے، اور ایک عظیم استاد کے لیے کون سی چیز اس کی توجہ کے قابل ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں، ان ہزاروں کتابوں میں سے جو تقریباً ہر مہینے ہمارے سامنے انباروں کی صورت میں پھینک دی جاتی ہیں۔ یہ تلاش کرنا مشکل ہے کہ وہ کون سی خاص کتاب ہے جس کا مطالعہ ہمارے لیے سودمند ثابت ہوسکتا ہے ہمارے اردگرد اَن گنت لغو تحریریں بکھری پڑی ہیں۔ یہ تحریریں کامکس سے شروع ہو کر سنسنی خیز مواد پر ختم ہو جاتی ہیں۔ آج کل ادیب یوں لکھتے ہیں جیسے لکھنا بھی روز کے معمولات کا ایک حصہ ہو اور اس حقیقت کے باوجود کہ دراصل ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا وہ ایسی ایسی اکتا دینے والی تصنیفات عوام کے سامنے پیش کرنے سے باز نہیں رہتے جن میں کوئی بیش قیمت بات نہیں ہوتی۔

اس زوال پذیری کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے؟ میکالے نے کہا جوں جوں تہذیب ترقی پذیر ہوتی ہے شاعری زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔ اس کی اس بات کا مطلب شاید یہ تھا کہ تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کے دل و دماغ مشینی ہوتے جاتے ہیں۔ وہ غیر فطری اور غیر ضروری بحث وتمحیص میں یوں الجھ کر رہ جاتا ہے کہ اس کے لیے سچائی تک پہنچنا اور خدائی تخلیق کے عظمت ومیلان کو محسوس کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے اس عہد میں عظیم ادیبوں کی کمی کا ایک بنیادی سبب اس دباؤ میں تلاش کیا جاسکتا ہے جو ہماری زندگیوں پر ہر روز زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ آج کے انسان کو اتنا کچھ جاننا پڑتا ہے اس کے احساس کی صلاحیت ان حقائق کے وسیع دائرے میں حیران ہو کر رہ جاتی ہے جنہیں جاننا اس کے لیے ضروری سا ہوگیا ہے۔ جدید انسان کو اتنا وقت میسر نہیں کہ وہ اس دنیا کے ساتھ جس سے وہ معاملہ کرتا ہے ایک قابل اطمینان گہرا جذباتی رشتہ قائم کرسکے۔ اس کے علاوہ جدید انسان کے تجربے کی دنیا میں کئی انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ یعنی اس کے تعلق کا پیمانہ وسیع ہوگیا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات سے اس کے لگاؤ کی نوعیت بھی بہت کچھ بدل چکی ہے۔ پھر ذرائع آمدورفت نے یہ کرم کیا ہے کہ ہم واقعات کے ایک بڑے دائرے میں شامل ہونے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اس خیال کو واضح کرنے کے لیے آیئے ذرا اس انسان کی زندگی کا تصور کریں جو آج سے ایک سو برس پہلے اس دنیا میں رہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں یا قصبے میں رہتا اور آمدورفت کا نظام کچھ ایسا تھا کہ وہ اسی گاؤں میں زندگی بسر کرتا، وہیں مر جاتا تھا اور اگر وہ کبھی باہر بھی جانا چاہتا تھا تو زیادہ دور جانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کا سفر عموماً سو میل سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اب ذرا اس انسان کا آج کے انسان سے مقابلہ کر کے دیکھیے اور اس کے سیر وسفر کے امکانات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کے وسط کا انسان اپنی تیز پرواز کے باعث پورے کرۂ ارض کو زیر قدم سمجھتا ہے۔ اس کی یہ پرواز محض جیٹ طیارے پر ہی منحصر نہیں بلکہ ریڈیو اور جدید دور کے اخبارات نے ارضی زندگی کے تمام مناظر پوری تفصیلات کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں۔ وہ شخص جو بی بی سی سے تقریر کر رہا ہوتا ہے مصنوعی اعتبار سے میرے گھر کا ہی ایک فرد بن جاتا ہے لیکن ساتھ والے گھر میں رہنے والا میرا حقیقی ہمسایہ مجھ پر بیتنے والے واقعات کا ایک اجنبی تماشائی بن کر رہ گیا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کا چیلنج

چند ہی لوگ ہیں جنہوں نے اس عظیم انقلاب کو محسوس کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے آباءاجداد ہمارے مقابلے میں کم لوگوں اور جگہوں کو جانتے تھے، لیکن ان جگہوں اور آدمیوں سے ان کی جان پہچان بہت گہری اور محسوساتی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ بھرپور زندگی بسر کرتے تھے اور گاؤں میں رہنے والے کسی بھی شخص کی خوشیوں اور غموں میں یوں شریک ہوتے تھے جیسے وہ خوشیاں اور غم ان کے اپنے دلوں پر وارد ہو کر ان کا ذاتی تجربہ بن گئے ہیں۔ ایسا جدید انسان کے لیے یقیناً ناممکن ہے کہ وہ ریڈیو سے نشر ہونے والے اور اخبارات میں چھپنے والے واقعات سے اپنا کوئی جذباتی رشتہ قائم کرسکے۔ ہمیں بہت کچھ جاننا پڑتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوتیں اس چیلنج کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جسے جدید ٹیکنالوجی کی کوکھ سے جنم لینے والی اس اجنبی دنیا نے ہمارے سامنے بڑا بنا کر کھڑا کردیا۔ اس عجیب وغریب صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید

انسان بھرپور زندگی گزارنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے، وہ اب قابل نہیں رہا کہ اپنے گرد ہونے والے کسی بھی واقعہ کو اپنے احساسات میں مکمل طور پر جاگزیں کر سکے۔ اس نے ایک خارجی تماشائی بننے پر اکتفا کرلیا ہے جو کسی بھی واقعے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کے ذہن میں اب ایسی گنجائش نہیں رہی کہ وہ اشیا کی سچائی کو ایک جذباتی واردات کے روپ میں سمجھے، اس کی بجائے وہ ایک تجریدی اور مصنوعی دنیا میں رہتا ہے، اس دنیا اور اس کے واقعات کے متعلق ہم اگرچہ اپنے آباء اجداد سے بہت زیادہ جانتے ہیں لیکن اس کی وجہ سے ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہماری جذباتی قوت ان واقعات کی وسیع سطح پر پھیل کر پایاب ہوگئی ہے اور اس طرح اپنے ارد گرد کی دنیا میں ہمارے رشتوں کا جذباتی رنگ اگر مٹا نہیں تو مدھم ضرور پڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی انسانی زندگی میں تصنع آ گیا ہے اور وہ اس الوہی تصور سے ترکِ تعلق کر بیٹھا ہے جس کا ذکر کارلائل نہایت والہانہ انداز میں کرتا ہے۔ ہم اپنے آپ سے صرف اسی لیے بیگانہ ہوگئے ہیں کہ ہم واقعات کے اس لامتناہی سیل رواں کو دیکھنے میں مصروف ہیں جس کے ساتھ ہمارا کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے۔

انسانی زندگی اسی وقت تکمیل پا سکتی ہے جب انسان کی شخصیت کا ہمہ پہلو اور متوازن ارتقا ہو" جذبہ" ایک ایسا آلہ ہے جو انسان کے مستقبل کی اسی چھوٹی سی گاڑی کو متحرک رکھتا ہے۔ یہ بات اتنی صحیح ہے کہ اس کو عالمی سچائی کا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ واقعہ جو انسان کے لیے ایک جذباتی تجربہ نہ بن سکتا ہو اس قابل ہی نہیں کہ انسان اس کا ادراک کر سکے، ادراک محض ایک ذہنی عمل نہیں ہے عقل اور حقیقت کی آویزش علم کو تو جنم دے سکتی ہے لیکن ادراک کو نہیں۔ کسی شے کا ادراک اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کی شخصیت کے تمام پہلو اس شے سے اثر پذیر ہوں۔ اس نام نہاد تہذیبی دور میں انسانی زندگی کی کیفیت میں زوال پذیری انسان میں اس صلاحیت کی کمی کی وجہ سے ہے جو اشیا کی حقیقت اور اشیا کے معانی کے تخلیقی ادراک میں مدد کرتی ہے۔ تمام الفاظ اس براہ راست احساس کے بغیر ایک ایسی چیز کا مشینی اظہار بن جاتے ہیں جو کوئی وجود نہیں رکھتی، یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری منطق اور نثر کی طرح سپاٹ ہے۔ کیونکہ یہ شاعری اب انسان کے اپنے اور اس کائنات کے جذباتی ادراک کا تخلیقی اظہار نہیں رہی، بہرحال ابلاغ کی صلاحیت اس سچائی کے تابع ہے جو ذاتی تجربے کے مرحلے سے گزر چکی ہو۔ جدید ادیب زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں کی کامیاب ترجمانی صرف اسی لیے نہیں کر سکتا کہ وہ ان پہلوؤں کو خود بھی دریافت نہیں کر سکا ہے، چونکہ شاعر کی روح میں شعری صداقت موجود نہیں ہوتی اس لیے شاعری میں لفظوں کی مصنوعی نمائش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جدید مصوری ڈرامے اور موسیقی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ دراصل آرٹ کے جدید نقادوں نے قریباً قریباً یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ کسی فنی تخلیق میں کسی واضح مفہوم کی تلاش ایک نامسعود کوشش ہے اور آرٹ کی عدم معنویت میں اس کے معنی پنہاں ہیں۔

حکمران اور علم وفن

اس کے علاوہ ایک المیہ یہ ہے کہ ہم دولت کو قاضی الحاجات سمجھنے لگے ہیں۔ اس لادینی دور میں ہم یہ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم لکشمی دیوی کو پوجتے ہیں۔ معاشی خوشحالی ہم سب کا فقہائے مقصود بن کر رہ گیا ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ دولت سے تہذیب کی بجائے سوقیت اور اوچھا پن نشو ونما پاتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ معاشی خوشحالی وہ چیز نہیں جس کو کوئی اہمیت حاصل ہو۔ انسانوں کو نورِ بصیرت کی ضرورت ہے اور جس قوم میں اربابِ بصیرت نہیں ہوتے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات بار بار سننے میں آتی ہے کہ حکومت کو فنون کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ یہ دور جس میں حکومت سے بہت کچھ امید کی جاتی ہے یہ خیال روز بروز جڑ پکڑ رہا ہے کہ حکومت عظیم آرٹسٹ اور ادیب پیدا کر سکتی ہے۔ یہ درست کہ ادیبوں کو بھی دوسرے آدمیوں کی طرح زندہ رہنا ہے اور اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب وسائل میسر نہ ہوں تو ان کا ذہنی ردعمل آنا شدید ہو سکتا ہے کہ وہ عظیم ادب تخلیق ہی نہ کر سکیں۔ لیکن مناسب وسائل کا حصول ایک الگ بات ہے اور حکومت سے فنون کی سرپرستی کی درخواست کرنا ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ لوگ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ پیسے سے ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے ان کی خدمت میں کارلائل کے وہ الفاظ پیش کرتا ہوں جو اس نے اسی سوال سے بحث کرتے ہوئے کہے تھے:

"میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ روپے کی صورت میں شاہی یا پارلیمانی امداد کی ضرورت نہیں۔ اربابِ علم کو وظائف دینا، تحفے عنایت کرنا اور ان کی طرف روپوں کی تھیلیاں بڑھانا ادب کی نشو ونما میں معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ روپے کی قاضی الحاجاتی کے بارے میں سُن سُن کر کان پک چکے ہیں، تو میں یہ کہوں گا کہ ایک باصلاحیت انسان کے لیے غریب ہونا کوئی بُری بات نہیں اور یہ کہ اربابِ علم وفن کو غریب ہی ہونا چاہیے، تاکہ ان کی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں۔ گرجوں میں ایسے ادارے قائم کیے گئے تھے جن میں داخل ہو کر ایک اچھے خاصے بھلے انسان کو بھیک مانگنا پڑتی تھی اور یہ ادارے عیسائیت کی روح کے ایک فطری اور لازمی ارتقا کا نتیجہ تھے۔ یہ عیسائیت کی بنیاد ہی غربت، دکھ اور صلیب پر رکھی گئی تھی۔ دنیاوی تکلیف اور عاجزی کا ہر عنصر اس میں شامل تھا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس نے ان اسباق کو اچھی طرح نہیں پڑھا اور ان چیزوں کے متعلق نہیں جانا اس نے اپنی تربیت کا ایک عمدہ موقع کھو دیا۔ بھیک مانگنا اور ایک کھردرا اونی کوٹ پہن کر اور اپنی کمر کے گرد رسیاں کس کر ننگے پاؤں چلنا اور ساری دنیا کی تحقیر کا نشانہ بننا کوئی خوبصورت کام نہیں تھا اور نہ ہی لوگ اسے قابل احترام سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کی شرافت، عالی ظرفی اور عظمت جنہوں نے یہ کام کیا بہت سے لوگوں کے لیے اس کام کو قابل احترام بنا گئی"۔

عظیم اہل قلم خوشحال نہیں تھے!

"فقر" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے لیے قابل فخر ہے" افلاس وہ پہلا مکتب تھا جہاں اس بے سہارا اور یتیم بچے کی اولین تربیت ہوئی۔ بہترین یونیورسٹی دکھوں کا مکتب ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں انسان کمال حاصل کرتا ہے۔ وہ عظیم اہل قلم جن پر انسانیت فخر کرتی ہے کوئی خوشحال لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنا طرز زندگی ہمیشہ درویشانہ ہی رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے، لیکن ایک اچھا فنکار پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، لیکن خدا کی اس دین کے استحقاق کی شرط یہ ہے کہ اس میں دیانتدارانہ اور بے باک اظہار کی جسارت ہو، اپنے خیالات میں دیانتدار اور راسخ ہو، یا اس میں اتنا اخلاص اور جرأت ہو کہ وہ سچ کو جس طرح دیکھتا اور جانتا ہے اس کا اسی طرح اظہار کر سکتا ہو۔ دوام ایک فنکار کا بہت بڑا انعام ہے اور یہ انعام اس کو ملتا ہے جو تمام رکاوٹوں کے باوجود صرف اس لیے ریاضت اور جدوجہد کرتا ہے کہ خدا کی منشا غالب ہو، یہی وہ لوگ ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کیا اہم ہے، کون سا گیت لافانی ہے اور کون سا گیت ہوا میں تحلیل ہو جانے والا ہے، کیا موزوں ہے اور کیا چیز اہمیت کی حامل ہے۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی سوسائٹی جس کی تعمیر کی فکر ہمیں ہر وقت مضطرب رکھتی ہے، لطافتِ تخلیقی کی

دشمن ہے؟ کیا یہ فرانسیسی ضرب المثل کہ ''خوشحال لوگوں کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی'' درست نہیں؟ وہ شخص جو دولت جمع کرنے کے علاوہ اپنا کوئی مقصد نہیں رکھتا اپنی زندگی میں دولت کے انبار تلے دبا دیا جاتا ہے۔ اس کو ہر وقت دولت محفوظ کرنے اور دولت بڑھانے کی فکر رہتی ہے اور یہ ایک ایسا ہمہ وقتی کام ہے جس کے بعد اسے کسی اور کام کے لیے فرصت نہیں ملتی وہ آدمی جو بہت زیادہ دولت رکھتا ہے، خواہ مخواہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے وہ تمام ذرائع میسر ہیں جن سے وہ اپنی تمام خواہشات پوری کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ صحیح ہے کہ جسم کی خواہشات مثلاً روٹی اور جنس، دولت سے حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن انسان میں ایک خواہش اور بھی موجود ہے جو سکون کے لیے تڑپتی رہتی ہے۔ اس کو روحانی آرزو کہا جاتا ہے اور اس آرزو کی تکمیل صحیح طور پر کبھی بھی نہیں ہوسکتی، خواہ کسی کے پاس کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو۔ وہ آدمی جو ان معنوں میں دولت مند ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا وہ دنیا کے ساتھ جس میں وہ رہتا ہے، جھوٹا رشتہ قائم رکھتا ہے وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ مسرت اور حسن کی کیا قیمت ہے اور الہامی بصیرت و قوت کا مقام کتنا بلند ہے۔ وہ اسے صرف یہی سمجھتا ہے کہ یہ چیز اس کے یوں کام آسکتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی محنت اور دوسرے انسانوں کی صلاحیت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے اور یوں اپنی ذاتی بڑائی اور تعیّشات کا سامان بہم کرے، اس جھوٹے رشتے میں اس کی شخصیت کی کوئی حقیقی نشوونما ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: ''ایک اونٹ کے لیے سوئی کے ناکے میں سے گزرنا آسان ہے، لیکن ایک آدمی کے لیے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا بہت مشکل ہے''۔

وسائل.....بوجھ نہ بننے پائیں!

مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں لیا جائے گا کہ میں مذہب افلاس کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر یہ انتخاب کرنا ہو کہ افلاس اچھا ہے یا بے انتہا امارت، تو میں یقیناً افلاس کو ترجیح دوں گا، لیکن زندگی میں ہمیں صرف یہی ایک انتخاب نہیں کرنا پڑتا۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے مناسب وسائل چاہئیں، لیکن یہ وسائل اتنے زیادہ نہ ہوں کہ بوجھ بن جائیں۔ وہ شخص جو اس دنیا میں اپنا کوئی سنگ میل چھوڑنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو اپنی املاک کے بوجھ سے ڈھانپنے نہ دے۔ تاریخ پر اثر انداز ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہماری نظریں آسمان کی رفعتوں کو چھو رہی ہوں اور ہم اس بات کی مسلسل کوشش کرتے رہیں کہ انسان نے اب تک جتنی اچھائیاں اور پاکیزگیاں حاصل کی ہیں ہم ان سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ مادی لذتوں کا حصول فیشن قرار پا گیا ہے اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی بجائے رہن سہن کے معیار کو بلند کرنے کا بہت چرچا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم حقیقی عظیم دماغوں کی کمی محسوس کر رہے ہیں بہرحال آدمی زندگی سے وہی کچھ حاصل کرتا ہے جس کی اسے تمنا ہوتی ہے۔ اگر سؤروں سے پوچھا جائے کہ کیا چیز انہیں لذت اور تسکین دیتی ہے تو وہ ایسا جواب دیں گے جو ان کے نقطۂ نظر سے بالکل ٹھیک ہوگا، لیکن انسان کے لیے اس میں کوئی معقولیت نہیں ہوگی، کیونکہ انسان میں تو الوہیت کا عنصر موجود ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ غیر مطمئن سقراط، مطمئن سؤر سے یقیناً بہتر ہے۔ تمام حساس دماغوں میں ایک ایسا الوہی اضطراب ہوتا ہے جو عظیم تمناؤں کو جنم دیتا ہے اور ان کی تکمیل کی صورت پیدا کرتا ہے، جب انسانیت زندگی کا یہ عظیم سبق پڑھ لے گی اس وقت ہم ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل ہوسکیں گے جن میں عظیم ادیب اور فنکار جنم لیا کرتے ہیں۔

معاشرے کو اپنے حقیقی بہی خواہوں کا احترام کرنے دو کہ ایسے لوگ ہر دور اور ہر اقلیم میں ہوتے ہیں جو شہرت کی روشنی سے دور گمنامی کے اندھیروں میں گم رہتے ہیں لیکن یہی وہ صاحب نظر لوگ ہیں جو ہمیں باوقار زندگی بسر کرنے کا سبق دیتے ہیں، یہ دوسروں کا کام ہے کہ وہ انہیں پہچانیں۔ جب کوئی قوم انسانی تاریخ کے حقیقی عظما کا احترام کرنا شروع کر دیتی ہے تو وہ انتشار اور بدامنی کی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس صورت میں یہ وہ روشنی دیکھتی ہے جو زندگی کی تاریک راہ گزروں میں مددگار ثابت ہوتی ہے ادیب اگر عظیم بننا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فی الحقیقت انسان ہو، کیونکہ عظمت و رفعت ایک عظیم روح کی آوازِ بازگشت ہے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور۔ جون ۱۹۶۵ء)

''بکھرتا ہوا ورلڈ آرڈر''، میونخ سیکورٹی رپورٹ

میونخ سیکورٹی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عوامی پسندانہ سوچ میں اضافے سے عالمی نظام کو خطرات لاحق ہیں، جب کہ اس رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے کہ مجموعی عالمی منظرنامے سے امریکا غائب ہو رہا ہے۔

میونخ سیکورٹی کانفرنس کی جانب سے پیر کے روز جاری کردہ سالانہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عالمی معاملات سے امریکی غیر حاضری کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلا کا فائدہ دوسرے عناصر اٹھا سکتے ہیں۔ کانفرنس کے چیئرمین وولفگانگ اِشنگر کی جانب سے اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی سطح پر صورتحال انتہائی غیر مستحکم ہے۔

یہ رپورٹ، ''سچ کے بعد، مغرب کے بعد اور نظام کے بعد'' کے نام سے جاری کی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ امریکا عالمی معاملات سے ممکنہ طور پر پہلوتہی کر سکتا ہے اور اس کا فائدہ دیگر قوتیں اٹھا سکتی ہیں۔ اس رپورٹ میں ''غیر لبرل تحریک'' کی مقبولیت میں تیزی سے اضافے کی وجہ سے بھی عالمی نظام کو لاحق خطرات کی جانب نشاندہی کی گئی ہے۔

میونخ سیکورٹی کانفرنس کے چیئرمین ایمبیسیڈر وولف گانگ اِشنگر نے کہا ہے، ''دوسری عالمی جنگ کے بعد سے کسی بھی موقع کے اعتبار سے آج عالمی سلامتی کا ماحول دگرگوں ہے۔ مغربی دنیا کے کچھ بنیادی ستون اور آزاد خیالی کا بین الاقوامی نظام کمزور ہو رہے ہیں''۔

ان کا مزید کہنا ہے، ''ہم شاید مغربی عہد کے خاتمے کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر مغربی عناصر بین الاقوامی امور طے کرنے لگیں گے۔ کیا ہم مغربی دنیا کے بعد کے دور کی جانب بڑھ رہے ہیں؟''

اس رپورٹ میں واضح طور پر عوامیت پسندی کے رجحانات میں اضافہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مغربی دنیا میں لبرل جمہوریت اور اس سے وابستہ ضوابط تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ گزشتہ برس ایک طرف تو برطانوی عوام کی جانب سے یورپی یونین سے انخلا کے حق میں ووٹ دیا گیا، جب کہ امریکا میں عوامیت پسند رہنما ڈونلڈ ٹرمپ کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ یورپ بھر میں عوامیت پسند تحریکوں اور جماعتوں کی مقبولیت میں بھی نمایاں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ جرمنی میں بھی مسلم اور مہاجرین مخالف عوامیت پسند جماعت اے ایف ڈی کی مقبولیت ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ نظر آ رہی ہے۔

(بحوالہ: ''ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام'' ۔۱۳ر فروری ۲۰۱۷ء)

لبرل اِزم کے خواب

منیر احمد خلیلی

دو تین بلاگرز اور سوشل میڈیا میں سرگرم آدمیوں کی گمشدگی نے کئی مباحث چھیڑ دیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی کو لاپتا کر دینا کسی بھی سماجی اور سیاسی نظام میں انتہائی ناپسندیدہ اور قابلِ مذمت عمل ہے۔ یہ عمل جو نائن الیون کے بعد 'دہشت گردی' کے عنوان سے پاکستان سمیت متعدد ممالک میں شروع ہوا تھا۔ امریکی CIA کی نگرانی میں پرویز مشرف جیسے حکمرانوں کی مرضی اور مفاد کے مطابق بڑے وحشیانہ طریقے سے جاری رہا۔ اس کی کچھ مثالیں میری مختصر کتاب 'مغربی جمہوریت کا داغ داغ چہرہ' میں موجود ہیں۔ اس عمل کا انتہائی شنیع اور ناقابلِ قبول ہونا ایک الگ پہلو ہے۔ یہاں میں اس موضوع کو ایک دوسرے زاویے سے زیرِ بحث لا رہا ہوں۔ بلاگرز اور سوشل میڈیا پر سرگرم چند افراد کی گمشدگی کے تناظر میں سیکولرازم اور لبرل ازم کا چرچا بڑی شد و مد کے ساتھ شروع ہو گیا ہے۔ اس فکر کے لوگوں کی خواہش اب اس دعوے کے ساتھ سامنے آ رہی ہے کہ ۲۰۳۰ء تک مذہب اور اخلاقی اقدار کے نام پر انسانی آزادی کے آگے بند باندھنے والے عناصر خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ساری دنیا میں لبرل ازم کے جھنڈے لہرا رہے ہوں گے۔ تقدیس اور عظمت نہ شخصیات کو حاصل رہے گی اور نہ مذہبی کتابوں اور اخلاقی اقدار اور خاص تہذیبی روایات کو بلکہ لبرل رویوں ہی کو سب سے مقدس و مقبول چیز مانا جائے گا۔ شخصی آزادی پر کسی عنوان سے کوئی قدغن قبول نہیں ہوگی۔ خواہ کوئی 'بھینسے' یا 'موچی' یا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز نام سے فیس بک اکاؤنٹ چلائے گا یا اخبارات میں کالم اور مضمون لکھے گا یا کارٹون بنا کر پیغمبر اسلامؐ اور قرآن جیسی آسمانی کتاب کا تمسخر اڑائے گا، کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ آزادی اظہار کے آگے کوئی رکاوٹ کھڑی کرے۔ ان مزعومات اور دعوؤں کو دیکھ کر یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوا کہ لبرل ازم اصل میں ہے کیا چیز؟ اس فلسفے کی تاریخ کیا ہے؟ یہ کس ذہن کی ایجاد ہے اور تاریخ میں اس فلسفے سے اقوامِ عالم میں سے سب سے زیادہ فائدہ کس قوم نے اٹھایا؟

لبرل ازم کا فلسفہ برطانوی مفکر جان لاک (John Locke) نے پیش کیا تھا۔ اسی لیے سولہویں صدی کے اس مفکر کو Father of classical liberalism کہا جاتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں ہے کہ جان لاک کو 'عہدِ تنویر' یا دورِ روشن خیالی (Enlightenment Age) پر اثر انداز ہونے والا سب سے بڑا مفکر مانا جاتا ہے۔ لبرل ازم فلسفہ کے اثرات کا دائرہ سماجی رویوں تک ہی محدود نہیں رہا تھا۔ اس نے معاشی اور سیاسی نظام پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ جان لاک خود سقراط، ارسطو اور افلاطون سے متاثر تھا، لیکن اس کی فکر نے بابائے معاشیات ایڈم اسمتھ اور برطانیہ میں آزادی نسواں کی علمبردار میری اسٹیل (Mary Astell) جیسے لوگوں کو بھی اپنے سحر میں لے لیا۔ برطانیہ اور پھر پورے یورپ میں آنے والی صنعتی معیشت کی صورت گری میں بھی جان لاک کے اس فلسفے نے اہم کردار ادا کیا۔ مغرب کے جمہوری اور سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم فکری بنیادیں اسی فلسفے نے فراہم کیں۔ ۱۸۲۵ء میں وضع ہو کر متداول ہونے والی اصطلاح Laissez-faire اس فلسفے کے مغز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب 'حکومت کی طرف سے کاروباری اور معاشی سرگرمیوں پر کم سے کم مداخلت' ہے۔ اسی فلسفے کی کوکھ سے ایک اور فلسفے 'روشن خیالی' (Enlightenment) نے جنم لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ سماجی زندگی کا سفر ماضی کی 'تاریک روایات' (جن سے اصل مراد مذہبی تعلیمات اور اصول ہیں) کے پرانے چھکڑے میں بیٹھ کر کرنے کے بجائے 'عقل' (Rationalism) کے گھوڑے پر سوار ہو کر کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکانہ فطرت سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے لبرل ازم کی فیکٹری کا بنا ہوا بے مہار شخصی آزادی کا لالی پوپ (Lolly pop) ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تھا۔ ریاست نے بڑی ہوشیاری سے فرد کی وفا اور اطاعت میں سے اپنا غالب حصہ رکھوا کر فرد کو لبرل ازم کے نام پر اس کی خواہشات کے پیچھے لگا دیا۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل و تسکین کے لیے یہ فلسفہ کہتا ہے کہ فرد کے مواقع، کسی چیز کے چناؤ اور عمل (Opportunities Choice & Action) کو حکومت، سماج اور مذہب کے دباؤ یا پابندی سے یکسر آزاد ہونا چاہیے۔

لبرل ازم کی تحریک کے عقب میں ہمیں اصلاحِ مذہب کی تحریک (Protestantism) کے نام کی ایک اور تحریک بھی نظر آتی ہے۔ ہم ذرا غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے یہ سارے فلسفے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے اور باہم تقویت دیتے نظر آتے ہیں۔ تحریک اصلاحِ مذہب کی یہ تعریف بیان ہوئی ہے: ''جدید مذہبی اصلاح پسندی کی تحریک، جو دانش و فکر کے میدان اور عیسائیت کے روحانی و اخلاقی موضوعات و مشمولات میں آزادی پر زور دیتی ہے''۔ لبرل ازم کی ایک اور تعریف ہے: ''ترقی پر یقین رکھنے والا ایک سیاسی نظریہ و فلسفہ ہے جو نسلِ انسانی میں ضروری اچھائی پر زور دیتا ہے، جو فرد کی خود مختاری کے علاوہ سیاسی اور سماجی آزادیوں کی ضمانت کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ ایک ایسا فلسفہ جس میں (نسلی، صنفی اور طبقاتی پہلوؤں سے) سماج کے اندر موجود عدم مساوات کو ختم کرنے میں حکومت کو سہولت کار اور مددگار تصور کیا جاتا ہو''۔

لبرل ازم کا تصور فرد کی آزادی سے چلا تھا لیکن آگے چل کر اس کے ڈانڈے سیکولرازم کے فلسفے کے ساتھ مل گئے۔ یہی نہیں بلکہ انسانی حقوق کے گرد گھومتا اور نسلی، صنفی اور طبقاتی یکسانیت و مساوات سے ہوتا ہوا یہ تصور سیاست و ریاست کے امور کو مذہب کے اثر سے محفوظ رکھنے پر جا ٹھہرا۔ ہمارے ملک میں بھی لبرل، سیکولر اور لبرل اسلامسٹ گروہ ریاستِ پاکستان کو اسی تصور کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ملکی امور کو اسی مغربی پیمانے سے ناپنے اور اسی کے سانچے میں ڈھالنے پر مُصر ہیں۔ لبرل ازم سے ان کی مراد یہ ہے کہ ریاست جمہوریہ ہو سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریہ نہیں ہو سکتی۔ ریاست کو نسلی، صنفی اور طبقاتی امتیازات ہی سے پاک نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں اسلام کو بحیثیت مذہب تفوق کا حق ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک ڈونلڈ ٹرمپ اور اس سے قبل کئی امریکی صدور کا بائبل کے نسخے پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانا قابلِ اعتراض نہیں، لیکن اگر کہیں کوئی پاکستانی صدر یا وزیرِ اعظم یا سپریم و ہائی کورٹ کا چیف جسٹس یا افواجِ پاکستان کے سربراہ ہاتھ میں قرآن لے کر اپنے منصب کا حلف اٹھا لیں تو اس کو یہ ریاست میں مذہب کی مداخلت سمجھتے ہیں۔ ٹرمپ صدارت کا حلف اٹھانے سے قبل اگر چرچ گیا تو یہ حرج کی بات نہیں، لیکن مملکتِ پاکستان کے جن عہدوں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے کوئی منصبی حلف سے پہلے مسجد میں جا کر دو نفل پڑھ لے تو یہ اس کی پرلے درجے کی بنیاد پرستی تصور ہوگی۔ ان لوگوں کو قراردادِ مقاصد کے متن سے بھی سخت خلجان محسوس ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لبرل ازم کو ریاست کے قوانین کی پابندی گوارا ہے لیکن اسے مذہب کی پابندی منظور نہیں ہے۔

ہم برطانیہ اور امریکا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ رومن کیتھولک عقیدے سے جدائی کے باوجود اپنے

مزاج کے لحاظ سے یہ ملک کبھی غیر مذہبی ملک نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے رومن کیتھولک عقیدے سے علیحدگی اختیار کی لیکن مذہب سے رشتہ نہیں توڑا۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ ریاست و معاشرت اور معیشت وتمدن میں مذہب کو دخل دینے سے روک دیا۔ امریکا کے موجودہ اور تمام سابق صدور کے عقائد کو دیکھیں تو عیسائیت کے دوسرے فرقوں کے ماننے والے تو ملتے ہیں لیکن رومن کیتھولک عقیدہ رکھنے والا صرف ایک جان ایف کینیڈی منتخب ہوسکا تھا۔ یہ حقیقت میں یہودیت کا رومن کیتھولک عقیدے سے ایک انتقام تھا کہ اسے تو عیسائی دنیا میں عضو معطل بنا دیا گیا لیکن ان ملکوں کی ہمہ جہتی پالیسیاں Zionized christianity کے تابع کردی گئیں۔ اس سے مراد صہیونی عیسائیت ہے۔ اب بھلے ڈونلڈ ٹرمپ بائبل کی تلاوت اور چرچ کی زیارت کرتے رہیں، وہ ملکی اور عالمی سطح پر جو پالیسیاں بنائیں گے وہ اسی صیہونی عیسائیت کے تقاضوں کے مطابق ہوں گی۔ عیسائیت کے 'تطہیر پسند' (Puritans) تصور اور صہیونی عیسائیت میں گہری قربتیں ہیں۔

مارٹن لوتھر کی اصلاحِ مذہب کی تحریک اس طرف پہلا قدم تھا اور اس کے بعد جان کالون (John Calvin) کی 'تطہیری تحریک' نے اس قربت کے باقی فاصلے بھی مٹا دیے تھے۔ تطہیر پسند وہ بااثر گروہ تھا جس نے ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی میں چرچ آف انگلینڈ کو رومن کیتھولک اثرات سے پاک کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ ۱۹۵۸ء میں برطانوی ملکہ الزبتھ اول کے تخت نشین ہونے کے بعد جب اس تحریک کا اثر ورسوخ شاہی دربار تک پھیلا تو برطانوی سیاست اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ چرچ آف انگلینڈ نے رومن کیتھولک چرچ سے جب اپنا رشتہ توڑا تو یہ بڑی حد تک Judaism اور عہد نامہ قدیم کے دورِ یعقوبی سے ہم آہنگ ہوگیا۔ برطانیہ کا یہی ریاستی عقیدہ بن گیا۔

انہی تطہیر پسندوں میں سے کچھ گروہ برطانیہ سے نکل کر شمالی امریکا کے شمال مشرقی حصے میں جا کر بسے اور وہاں New England کے نام سے پانچ چھ ریاستوں پر مشتمل بستیاں آباد کیں اور وہاں اس فکر کو مقبول بنایا۔ امریکا کی مذہبی ہی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی زندگی پر بھی ان تطہیر پسندوں نے اپنا رنگ چڑھایا۔ امریکا ریاستی حیثیت سے تثلیث کے عقیدے سے منحرف ہوکر پروٹسٹنٹ یا Unitarians کے عقائد سے ملتے جلتے فرقوں کے تابع ہوگیا۔ یہ محض کوئی سازشی نظریہ (Conspiracy theory) نہیں، بلکہ تاریخ کے سانحات و واقعات کی کڑیاں ملائیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یورپ میں سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جو فلسفے اور نظریے مروج ہوئے اور جو فکری تحریکیں برپا ہوئیں، ان کے پیچھے یہودی ہاتھ تھا اور ان کا سب سے زیادہ فائدہ صہیونیت کو ہوا۔ صہیونیت یہودی مذہب کا عالمی سطح کا ایک ایجنڈا ہے۔ اس سے مراد یہودیوں کو ان کے اجداد.....ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ.....کی سرزمین فلسطین پر آباد کر کے انہیں داؤد اور سلیمان علیہم السلام کے دور کی عظمت و شوکت اور طاقت سے ہمکنار کرنا ہے۔ مسیحیت صہیونیت کے تابع ہوئی تو گویا اب یہ اس امر کی پابند ہے کہ وہ اس منزل تک پہنچنے میں یہودیوں کی ہر طرح سے مدد کرے۔ یہودیوں کے لیے فکری اور اعتقادی طور یہ منزل قریب لانے کے لیے ضروری تھا کہ پاپائے روم کے تابع طاقتور عیسائیت کا رسوخ و اقتدار محدود کیا جائے اور ایسے سیاسی و معاشی اور سماجی نظریے پیش کیے اور روبہ عمل لائے جائیں، جن کے نتیجے میں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی وجہ سے عیسائیوں کے دل میں بیٹھی ہوئی نفرت زائل کردی جائے، جس کی وجہ سے صدیوں سے عیسائی یہودیوں پر مظالم توڑ رہے تھے۔ گزشتہ کئی صدیوں میں رومن کیتھولک چرچ انہی فلسفوں اور تحریکوں کے دباؤ میں آیا۔ صورتحال یہ ہوگئی کہ کچھ عرصہ قبل پوپ پال ثانی اور ان کے جانشین پوپ بنڈیکٹ شانزدہم (xvi) نے باقاعدہ فتویٰ کے ذریعے یہودی قوم کو قتلِ مسیح سے بَری قرار دے دیا۔

تاریخی حقیقت یہی ہے کہ مذہبی اصلاح پسندی کی تحریک ہو یا تحریکِ تطہیر، لبرل ازم ہو یا سیکولرازم، جمہوریت ہو یا سرمایہ دارانہ معاشی نظام ان سب کی پشت پر یہودی ہاتھ رہا ہے۔ ان فلسفوں اور نظریات اور نظاموں سے سب سے زیادہ مستفید ہونے والے یہودی ہی چلے آرہے ہیں۔ عیسائی عقائد میں اس اتھل پتھل کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ چرچ نے جاگیردار طبقہ اور اُس زمانے کی اصطلاح میں Nobles (اشراف) کی صورت میں طاقتور سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ ملی بھگت کر کے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ صلیبی جنگوں کے عرصے سے لے کر پندرہویں صدی تک بحیثیت مذہب رومن کیتھولک عقیدے کی روح فنا ہوچکی تھی۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں پر بھی اتنے ہی مظالم توڑے گئے تھے، جتنے مسلمانوں پر ٹوٹے تھے۔ یورپی ممالک میں سولہویں صدی تک یہودی سخت سرکاری پالیسیوں کا مسلسل نشانہ بن رہے تھے۔ برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ اول کے زمانے میں یہودیوں کو دیوار سے لگائے رکھا گیا۔ ان پر بھاری ٹیکس عائد کیے گئے اور سخت پابندیاں لگی رہیں۔ آخر ۱۲۹۰ء میں اس بادشاہ نے ان کو برطانیہ سے نکل جانے کا حکم صادر کردیا تھا۔ رومن کیتھولک چرچ کے خلاف اصلاح پسندوں کی بغاوت کے پیچھے واضح طور پر یہودی ہاتھ تھا۔ مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاح کے معاً بعد تطہیری تحریک شروع ہوگئی تھی۔ آلیور کرامویل جو دس سال تک تطہیری تحریک کا روحِ رواں رہا اور برطانیہ کی مذہبی بنیادوں پر خانہ جنگی میں شاہ پسندوں کے مقابلے میں پارلیمان پسندوں کے لشکر کا سالار اور ایک مدبر آدمی مانا جاتا تھا، اس کے دباؤ پر ۱۶۵۶ء میں یہودیوں کو دوبارہ انگلینڈ میں آکر آباد ہونے کی اجازت ملی۔ تطہیری تحریک کے تصورات ہی کا اثر تھا کہ مسیحیت کو صہیونی عیسائیت کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ اس وقت میرے سامنے لبنانی مصنف محمد سماک کی دوسری بار ۱۹۹۳ء میں شائع ہونے والی کتاب 'الاصولیة الانجیلیة والصهیونیة المسبحة والموقف الامریکی' کھلی پڑی ہے۔ مصنف نے ایک تفصیلی بحث میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اصلاحی اور تطہیری تحریکیں عیسائیت کو انجیلی اصولیت سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تھیں یا مسیحیت کو صہیونی رنگ میں رنگنے کے لیے تھیں؟ اعداد و شمار اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ مصنف نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ یہ تحریکیں دراصل عیسائیت کو مشرف بہ صہیونیت کرنے کے لیے اٹھی تھیں۔

جس عرصے میں تطہیر پسند شمالی امریکا میں جا کر آباد ہو رہے تھے، اسی عرصے میں بہت سے یہودیوں نے بھی یورپ سے نقل مکانی کی اور امریکا میں جا بسے تھے۔ انسانی مساوات، ذرائع ابلاغیات اور اظہار و تقریر کی آزادی، مذہبی آزادی، معاشی سرگرمیوں اور کھلی مارکیٹ اور نقل و حرکت کی آزادی جیسے اصول امریکا کے آئین اور جمہوری نظام کی بنیاد قرار پائے۔ جس گروہ نے اس نظام میں سب سے زیادہ عافیت محسوس کی وہ یہی یہودی تھے۔ وہی جمہوری آزادیوں اور انسانی حقوق کے تصورات کے بڑے Beneficiary بنے۔ انہوں نے بہت جلد امریکا کے اگلی صف کے سیاسی دل و دماغ میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ جان ایڈمز امریکا کے پہلے نائب صدر اور دوسرے صدر (۱۷۹۷-۱۸۰۱ء) تھے۔ عہدِ روشن خیالی کے معروف فرانسیسی فلسفی والٹیئر کی یہودیوں کے بارے میں ایک منفی رائے پر جان ایڈمز نے والٹیئر سے ایک گرما گرم قلمی مناظرہ کر دیا تھا۔ منصبِ صدارت سے فارغ ہونے کے سترہ سال بعد ۱۸۱۸ء میں یہ جان ایڈمز ہی تھے جنہوں نے پہلی بار فلسطین کی سرزمین بطورِ وطن یہودیوں کو لوٹانے کا مطالبہ کیا تھا۔ فلسطینیوں سے

ان کا وطن چھیننے کی داستان جتنی المناک ہے، اسی قدر طویل ہے۔ یہاں مقصد صرف یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی کے تمام جدید نظریات کی آبیاری بھی صہیونیوں نے کی تھی اور اس فصل کا بڑا حاصل یہودیوں ہی کے آنگن میں پڑا تھا۔ لبرل ازم کا پودا انہی کے گملے میں اُگا تھا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ مغرب کی عیسائی دنیا کو لبرل ازم کے پیچھے لگا تو دیا مگر یہودی خود لبرل نہیں بنے۔ وہ آج بھی اپنی مذہبی روایات اور تلمودی تعلیمات کے بڑی حد تک پابند ہیں۔ معروف مگر سستی سی مثال کے مطابق یہودیوں نے دنیا کو ٹرک کی اس بتی کے پیچھے لگا دیا جس پر بڑے دلکش انداز میں 'لبرل ازم' لکھا ہوا ہے، لیکن وہ خود اس ٹرک میں سوار نہیں ہوئے۔

ہمارے ہاں لبرل ازم کے کچھ شیدائی اس کی تائید اپنے مذہبی مصادر سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سیکولر ہوں یا لبرل اسلامسٹ، تاریخ کے ان ابواب سے یا تو قطعی طور پر ناواقف ہیں یا پھر ان فلسفوں کا جادو اُن کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ لبرل اسلامسٹ دانشور یا تو کمال کی سادگی سے یا پھر زبردست ہوشیاری کے ساتھ لبرل ازم اور اسلام میں مشترک قدریں اور یکساں روایات ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے ہیں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ جس شجر کا نام لبرل ازم ہے اور جس کے ساتھ 'مادر پدر آزادی' کا پھل لگتا ہے اس کی سرزمینِ اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام آزادی عمل و اظہار کو پروان چڑھنے سے نہیں روکتا لیکن یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کی جڑیں اسلام کے بنیادی اصولوں کی زمین میں پیوست رہیں۔ اسلام میں ایسی حریتِ افکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی:

چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم کدہ آباد

خالص اسلام کے ساتھ ایسی مشترک قدریں تو تحریکِ طالبان، القاعدہ، داعش وغیرہ میں کہیں زیادہ موجود ہیں۔ یہ تین چار گروہ تو اس کے ضابطۂ حیات ہونے کو مانتے اور اس کا نفاذ چاہتے ہیں۔ لیکن امت کے اجتماعی ضمیر نے ان کے دہشت گردانہ طریقِ کار کی وجہ سے ان کو مسترد کر دیا ہے۔ ایسے چند نکات تو ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ دھرم اور دنیا کے ہر دوسرے مذہب سے بھی نکال کر لائے جا سکتے ہیں۔ اگر ان چند نکات کی بنا پر ہم پاکستان کو ایک ہندو، سکھ، بدھ، جین یا کسی اور مذہب کا مرکز نہیں بنا سکتے تو اسلام کی کچھ جھلکیاں لبرل ازم میں دیکھ کر اس ملک کا مستقبل اس فلسفے سے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟

(بحوالہ: "munir-khalili.blogspot.com" ۔۲۳ جنوری ۲۰۱۷ء)

مستقبل کی افغان ریاست اور طالبان

چوتھی قسط

سیاسی ونگ سے جامع گفتگو

طالبان کے سیاسی ونگ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خیالات اور نظریات جاننے کے لیے ۹ شخصیات سے انٹرویو کیے گئے۔ ان میں سے ایک شخصیت کا چونکہ طالبان سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس کے خیالات اس رپورٹ میں شامل نہیں کیے گئے۔ اسی طور جن دو دو شخصیات نے دوسروں کے خیالات کی محض تصدیق کی اور اپنے خیالات کے اظہار سے اجتناب برتا ان کی باتیں بھی اس رپورٹ کا حصہ نہیں بنائی گئیں۔

زیر نظر رپورٹ میں جن ۱۶ شخصیات سے کیے جانے والے انٹرویوز کے مندرجات پیش کیے جا رہے ہیں ان کی شناخت پوشیدہ رکھی گئی ہے، تاہم انگریزی کے دو حروف پر مبنی نام ہر ایک کو ضرور دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جا رہا ہے تاکہ قارئین اس شخصیت کے بارے میں تھوڑا بہت اندازہ ضرور لگائیں۔

وائی ایم۔۔۔ یہ طالبان کے سیاسی دفتر (قطر) کے ایک رکن ہیں۔ طالبان کے تحت قائم اسلامی امارت میں انہیں امور خارجہ سے متعلق اہم منصب سونپا گیا تھا۔

ایس این۔۔۔ یہ قطر میں واقع سیاسی دفتر کے رکن ہیں مگر ان کا طالبان کے حوالے سے کوئی سابق پس منظر نہیں۔

بی کے۔۔۔ سابق سفارت کار ہیں۔ قطر میں دفتر کے قیام سے قبل یہ امن کوششوں کے حوالے سے خاصے متحرک تھے۔ اب قطر میں مقیم ہیں۔

ایل ایم۔۔۔ اس وقت طالبان کے سیاسی دفتر (قطر) سے وابستہ ہیں۔ سابق رکن نہیں۔ طالبان کی قیادت میں شامل بیشتر شخصیات سے خاندانی مراسم ہیں۔

ایم ایچ۔۔۔ یہ صاحب پاکستان سے طالبان کے میڈیا آپریشنز چلانے میں معاونت کرتے رہے ہیں۔ اسلامی امارت کے دور میں بھی ان کی ایسی ہی پوزیشن تھی۔

سی ایچ۔۔۔ ان کا تعلق طالبان کے میڈیا آرم سے ہے۔ امارت کے دور میں میڈیا آفیشل تھے۔ طالبان کی سرکردہ شخصیات سے ان کے خاندانی مراسم ہیں۔

بی ایس۔۔۔ پاکستان میں مقیم ہیں۔ تعلق طالبان کے میڈیا آرم سے ہے۔ میڈیا میں اور عوامی سطح پر دانش ورانہ یکسوئی کے ساتھ طالبان کا موقف بیان کرنے میں یہ پیش پیش رہے ہیں۔ طالبان کے چند میڈیا آؤٹ لیٹس چلانے میں بھی معاونت کرتے رہے ہیں۔

اے ایم۔۔۔ یہ طالبان قیادت سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیت ہیں۔ امارت کے دور میں کلیدی وزیر رہے۔ حالیہ امن کوششوں میں انہوں نے غیر معمولی معاونت کی ہے۔

ڈی ایف۔۔۔ سابق سفارت کار ہیں۔ اب افغان حکومت کی طرف سے طالبان قیادت سے روابط استوار رکھے ہوئے ہیں تاکہ مصالحت کا عمل تیز ہو۔

پی ڈی۔۔۔ مذہبی لیڈر ہیں۔ امارت کے دور میں وزیر رہے۔ نظریاتی ونگ سے وابستہ، شریعت سے متعلق توضیح کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ افغان حکومت سے مصالحت کرانے کے معاملے میں طالبان سے رابطے میں رہتے ہیں۔

این ڈبلیو۔۔۔ ملا عمر کے دفتر میں کام کرتے رہے ہیں۔ قندھار میں طیب آغا سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اب آزاد اور غیر جانبدار حیثیت رکھتے ہیں، تاہم طالبان سے روابط ہیں، بالخصوص جنوب مشرقی افغانستان میں۔

ایل اے۔۔۔ طالبان کے بانی ارکان میں سے ہیں۔ اب باضابطہ رکن تو نہیں ہیں تاہم طالبان کی اہم شخصیات سے رابطے میں رہتے ہیں۔

ایس ایچ۔۔۔ سابق نائب وزیر ہیں۔ میڈیا سے روابط ہیں۔

ڈبلیو ڈبلیو۔۔۔ وزارتِ خارجہ کے سابق افسر ہیں۔ مصالحت کے حوالے سے طالبان کی اعلیٰ قیادت سے رابطے میں ہیں۔

آر زیڈ۔۔۔ سول سوسائٹی کی اہم شخصیت ہیں۔ طالبان کے ایک کمانڈر کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

ایم کیو۔۔۔ طالبان کمانڈر ہیں۔ اب دنڈ، قندھار میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

حدود کا اعتراف

اس رپورٹ کی تیاری کے لیے جو طریق کار اختیار کر گیا اُس میں تین بنیادی خامیاں رہ گئی ہیں۔

☆ انتخاب میں جانبداری کا ارتکاب ہو گیا۔ صرف ان طالبان کا انٹرویو کیا گیا ہے جو دوسروں کو قبول کرنے کا مزاج رکھتے ہیں۔

☆ بیشتر شخصیات کا تعلق سیاسی ونگ سے ہے۔ غیر عسکری شخصیات سے بات کرنے کے باعث یہ معلوم کرنا انتہائی دشوار

ہوگیا کہ جو لوگ اب تک میدان میں ہیں، یعنی غیر ملکی افواج اور افغان فورسز سے برسر پیکار ہیں وہ کیا سوچتے ہیں اور مستقبل کے افغانستان کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے۔ انٹرویوز کے دوران بیشتر شخصیات نے تسلیم کیا کہ عسکری ونگ کی کھڑی کی ہوئی مشکلات تنظیمِ طالبان کے پورے ڈھانچے کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ جو کچھ ان انٹرویوز میں بیان کیا گیا ہے اُسے طالبان کی نمائندہ سوچ سمجھ کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ عسکری ونگ والوں کی ٹھوس رائے سامنے نہیں آسکی۔

اقتدار میں شراکت: کون موافق ہے؟

آیے، اقتدار میں شراکت کے حوالے سے طالبان کی تاریخ کا جائزہ لیں۔

۱۹۹۰ء کے عشرے میں طالبان نے سابق مجاہدین کے ایک گروپ سے گفت وشنید کی مگر بات نہ بنی۔ طالبان اور دیگر نے مل کر کوشش کی، مگر ۲۰۰۱ء تک معاملات زیادہ تبدیل نہ ہوئے۔ طالبان کی اہم شخصیات نے اپنے انٹرویو اور چند حالیہ بیانات میں تسلیم کیا ہے کہ سیاسی اجارہ داری سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ طالبان قیادت سے تعلق رکھنے والے ارکان نے بھی اب جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور نبھانا شروع کر دیا ہے۔

انٹرویوز میں طالبان کی اہم شخصیات نے اسلامی امارت کے دور میں اقتدار میں شراکت کے حوالے سے کیے جانے والے تجربات یا کوششوں کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے تین خطوط پر اپنے خیالات بیان کیے۔

☆ اسلامی امارت چاہتی تھی کہ مستقل میں اقتدار میں شراکت کا ڈھانچا تیار کرنے کے حوالے سے کوئی وسیع البنیاد معاہدہ ہو جائے۔ کابل میں وزراء کونسل بنائی گئی مگر ابتدائی مرحلے میں نگراں حکومت تشکیل دی گئی تھی۔ وزراء کی حیثیت نگراں کی ہوگی۔ اسلامی امارت نے اس اتفاق رائے کے ساتھ کام شروع کیا کہ سیاسی حریفوں کو بھی ایڈجسٹ کیا جائے گا اور اگر اس کے لیے چند ایک ''اپنوں'' کو وزراء کونسل سے نکالنا بھی پڑا تو ایسا کرنے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔

☆ انٹرویوز میں بتایا گیا کہ کئی مواقع پر اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک کیا گیا۔ ۱۹۹۹ء کی کابینہ میں طالبان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو بھی شریک کیا گیا۔ پس منظر بتاتا ہے کہ طالبان کی قیادت اپنے گروپ یا حلقے سے کہیں آگے بڑھ کر دوسروں کو اپنانا اور احترام سے نوازنا چاہتی تھی۔ طالبان نے ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء کے دوران حکومت کو غیر معمولی حد تک وسیع البنیاد بنانے کی کوشش کی۔ اس کے لیے خوست میں جلال الدین حقانی، کابل میں حرکت انقلابی کے سربراہ مولوی محمد نبی، حرکت انقلابی کے نمائندوں منصور (پشاور)، زرمت (پکتیا) اور حزب اسلامی (خالص گروپ) کے مولوی یونس خالص سے بات چیت کی گئی۔

☆ شمالی اتحاد اور شیعہ جماعتوں سے بھی معاملات طے کرنے کے حوالے سے بات چیت کی گئی۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران متعدد مواقع پر احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی سے رابطہ کر کے اقتدار میں شراکت پر بات چیت کی گئی۔ اسی طور ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۰ء تک شمالی اتحاد کے ازبک جنگجو رہنما عبدالرشید دوستم سے بھی معاملات درست رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ممکن ہوا کہ ۱۹۹۷ء میں عبدالرشید دوستم کے منحرف کمانڈر جنرل مالک سے بھی طالبان نے مذاکرات کیے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں جو معاہدہ طے پایا اس کی بنیاد ہی پر طالبان مزارِ شریف میں داخل ہو پائے۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد جنرل مالک پلٹ گئے۔ انہوں نے طالبان سے کیے ہوئے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے طالبان کے خلاف ہتھیار اٹھالیے۔ تنظیم طالبان کے ہزاروں کارکن مارے گئے اور چند سرکردہ شخصیات کو قید کرلیا گیا۔ جنرل مالک کی طرف سے اس نوعیت کی غداری کو بنیاد بنا کر طالبان میں اعلیٰ سطح کی شخصیات نے مذاکرات کی مخالفت شروع کردی۔ جنرل مالک کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ طالبان نے وعدہ خلافی کی تھی۔ انہوں نے جنرل مالک کو محض نائب وزیر دفاع بنایا جبکہ وہ شمالی افغانستان کا کنٹرول چاہتا تھا۔

شمالی اتحاد سے اسی سال پھر بات چیت شروع کی گئی۔ پی ڈی نے بتایا کہ طالبان برہان الدین ربانی کو وزراء کونسل کا سربراہ بنانے کے لیے تیار تھے مگر بات نہ بن سکی۔

مارچ ۱۹۹۷ء میں اشک آباد میں مذاکرات میں شریک اے ایم نے بتایا کہ ملا عمر قیادت چھوڑنے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر پھر مجموعی سپریم لیڈر کے حوالے سے اختلافات شروع ہوئے۔ سابق مجاہدین نے اس بات پر اصرار کیا کہ سابق بادشاہ ظاہر شاہ کو نگراں حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے لایا جائے۔ اسی صورت وسیع البنیاد حکومت کی راہ ہموار ہوگی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ظاہر شاہ مذہبی رہنماؤں سے الرجک تھے۔ وہ ایسی حکومت نہیں بنا سکتے تھے جس میں معاشرے کے ہر طبقے اور جماعت کی نمائندگی ہو۔

ان تمام باتوں سے عمومی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ طالبان کی قیادت اقتدار میں دوسروں کو شریک کرنے پر آمادہ تھی۔ ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ طالبان قیادت کلیدی معاملات کسی اور کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ فوج کی تشکیل کے معاملے میں وہ کسی پر زیادہ بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھی اور اوامر ونواہی کی وزارت سے متعلق معاملات بھی کسی کو سونپنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر کبھی کوئی کلیدی منصب کسی ''غیر'' کو دیا بھی جاتا تھا تو اس کی کوئی واضح سیاسی شناخت نہیں ہوتی تھی۔

جب طالبان نے سب کو کھلے دل نے اپنایا تو قول وفعل کا تضاد پیدا ہوا اور ان کی حکومت کا سیاسی جواز دب کر رہ گیا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ افغانستان قومی ریاست ہے۔ طالبان نے بھی اِسے قومی ریاست ہی کے طور پر برتنے کی کوشش کی۔ کابل میں وہی حکومت تادیر قائم رہ سکتی تھی جس میں معاشرے کے ہر طبقے کی بھرپور نمائندگی ہو اور اقتدار میں سب کا حصہ وہی ہو جو ہونا چاہیے۔ طالبان نے دوسروں کو اقتدار میں شریک کرنے کی بات ضرور کی مگر شریک کرنے کا عمل خاصا نیم دلانہ تھا۔

ڈی ایف نے بتایا کہ جاگیرداری اور جنگجوئی کو محض چند مراعات دے کر یا سب کو ملا کر چلنے والا نظام بنا کر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جاگیردار اور جنگجو رہنما موقع ملتے ہی اپنی طاقت بحال کرنے اور اس میں اضافہ یقینی بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگر ملک کو مستحکم رکھنا ہے تو ایک ایسا نظام لانا ہوگا جس پر سب کا اتفاق ہو اور جنگجو رہنماؤں یا جاگیرداروں کو پنپنے کا زیادہ موقع نہ ملے اور وہ ریاست کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہ آسکیں۔ شدید انتشار کی حالت میں کوئی بھی ریاست اسی طور تعمیر وترقی کے مراحل سے گزرتی ہے۔

پی ڈی نے بتایا کہ طالبان نے جو حکومت قائم کی تھی وہ انقلابی نوعیت کے اقدامات پر یقین رکھتی تھی اور اس کا ایک ٹھوس سبب بھی تھا۔ ملک میں کوئی باضابطہ اور بھرپور حکومت نہ تھی۔ ریاستی مشینری بھی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ ایسے میں صرف ان کے ساتھ کام کیا جاسکتا تھا جن پر پورا بھروسہ تھا۔ اور جو بھی رکاوٹ اٹھ کھڑی ہوتی تھی اسے ہٹانے ہی کا سوچا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت تک کیا جانا تھا جب تک انتشار ختم نہ ہو جاتا اور ملک میں نظم مکمل طور پر بحال نہ ہو جاتا۔

جو کچھ طالبان قیادت نے کیا اس کے نتیجے میں شدید دورنگی اور دورخی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسلامی امارت کے تحت تمام گروپوں سے بات ضرور کی گئی مگر انہیں اقتدار میں حقیقی شراکت سے ہمکنار کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی گئی۔ سیاسی اور نظریاتی اختلاف رکھنے والی سرکردہ شخصیات کو چند ایک آفر ضرور کی گئیں مگر وہ محدود نوعیت کی تھیں۔ برہان الدین ربانی کو وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش ضرور کی گئی مگر کلیدی وزارتیں دینے سے صاف انکار کردیا گیا۔

باقی صفحہ نمبر ۵

امریکی داخلی سلامتی کے ''نئے'' وزیر۔ایک تعارف

عماد الملیک

امریکا میں داخلی سلامتی کے نئے وزیر اور صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے قابل اعتماد ساتھی جون فرانسیس کیلی امریکا میں غیر ملکی شہریوں کی آمد محدود کرنے کے فیصلے کے مرکزی کردار ہیں اور انہیں ٹرمپ انتظامیہ کے تیسرے اہم عہدیدار کا مقام بھی حاصل ہے۔

۶۷ سالہ جنرل ریٹائرڈ جون کیلی امریکی بحریہ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکے ہیں۔انہوں نے بحری افواج کی پیادہ یونٹ کی کمان کی اور ۴۵ سال فوج میں کام کیا۔ وہ اس عہدے پر ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا میں صدر بش کے دور میں ہونے والے حملوں کے بعد پانچویں اہم شخص ہیں۔

العربیہ ڈاٹ نیٹ نے جون کیلی کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے بارے میں دس دلچسپ حقائق مرتب کیے ہیں، جو قارئین ''معارف فیچر'' کے مطالعہ کے لیے پیش خدمت ہیں۔

تعلیم اور ابتدائی زندگی

جون کیلی ۱۱ر مئی ۱۹۵۰ء کو امریکی ریاست ماساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں پیدا ہوئے۔ان کے خاندان کا مذہبی پس منظر آئرلینڈ کے کیتھولک چرچ سے ہے۔انہوں نے ابتدائی زندگی بوسٹن کی برائیٹون کالونی میں بسر کی۔سولہ سال کی عمر میں انہوں نے ریل گاڑی کے ذریعے ریاست واشنگٹن کا پہلا سفر کیا۔واشنگٹن میں ایک سال تک بحری تجارتی قافلوں کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ فوجیوں کے لیے ۱۰ر ہزار ٹن شراب لے کر گئے۔

۱۹۷۰ء میں انہیں باضابطہ طور پر بحری فوج کے پیادہ دستے میں شامل کیا گیا۔ دو سال تک سارجنٹ کی خدمات انجام دینے کے بعد انہوں نے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔

۱۹۷۵ء میں انہوں نے فوج میں دوبارہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔۱۹۷۶ء میں انہوں نے بوسٹن یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور ۱۹۸۴ء میں قومی سلامتی کے شعبے میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔

کیریئر کے مراحل

جون کیلی کا فوجی کیریئر کئی اہم مہمات سے بھرپور رہا ہے۔ انہوں نے ریاست فلوریڈا میں امریکا کے دوسرے میرینز بریگیڈ میں آپریشن آفیسر کے معاون کے طور پر کام شروع کیا۔ کچھ عرصے بعد انہیں بحریہ کے خفیہ پیادہ یونٹ کا انچارج مقرر کیا گیا۔ وہاں سے وہ جارجیا ریاست منتقل ہوئے جہاں بحریہ کے مسلح یونٹ میں خدمات انجام دیں، پھر دارالحکومت واشنگٹن میں بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک مہمات کے مبصر کے طور پر کام کیا۔

۱۹۸۷ء میں انہیں میجر کے عہدے پر ترقی مل گئی اور ساتھ ہی نیول بریگیڈ میں ایک افسر کی حیثیت سے کام کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ نیوی میں خدمات انجام دیتے ہوئے وہ امریکا میں ایک سے دوسرے مشن کی طرف بڑھتے چلتے گئے۔ ۲۰۰۱ء سے قبل انہوں نے بیلجیم میں امریکی اتحادیوں اور یورپ کے سپریم کمانڈر کے معاون کے طور پر خدمات انجام دیں۔

۲۰۰۲ء میں جون کیلی کو پہلی بار نیوی کے شعبے کا معاون مقرر کیا گیا، اس دوران انہوں نے دو سال تک عراق میں بھی خدمات انجام دیں۔۲۰۰۳ء میں عراق میں تعیناتی کے دوران ان کی بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ ۱۹۵۱ء کے بعد نیوی میں اس عہدے پر جون کیلی کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکا۔

عراق سے واپسی کے بعد انہیں بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور ۲۰۰۸ء میں انہیں مغربی عراق میں مختلف قومیتوں کا نگران مقرر کیا گیا۔

فوجی عہدے

جنوری ۲۰۱۶ء کو فوج سے ریٹائرمنٹ سے قبل وہ فوج میں کئی اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہے۔انہوں نے اندرون اور بیرون ملک کئی اہم فوجی مہمات میں حصہ لیا۔کئی مہمات کی خود کمان کی۔ وسطی امریکا، بحر کاریبین اور جنوبی امریکا میں اہم فوجی خدمات انجام دیں۔کچھ عرصہ سابق وزیر دفاع لیون پینیٹا کے ساتھ عسکری مشیر کے طور پر بھی کام کیا۔

جنگ میں بیٹے کی قربانی

جون کیلی امریکی بحریہ کے واحد افسر ہیں جن کا ایک بیٹا ۲۰۱۰ء میں افغانستان میں مارا گیا، جان کیلی کا بیٹا رابرٹ امریکی میرینز میں فرسٹ لیفٹیننٹ کے عہدے کا افسر تھا۔

موجودہ عہدے کے لیے نامزدگی

نومنتخب صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ۷ر دسمبر ۲۰۱۶ء کو انہیں امریکا میں داخلی سلامتی کے وزیر کے عہدے کے لیے نامزد کیا۔ٹرمپ نے ان کی امریکا کی جنوب مغربی سرحدوں پر کام کی مہارت سے متاثر ہو کر انہیں اس اہم عہدے کے لیے نامزد کیا ہے۔

بالآخر ۲۰ جنوری ۲۰۱۷ء کو امریکی ایوان نمائندگان نے ۱۱ر ووٹوں کے مقابلے میں ۸۸ ووٹوں کی حمایت سے جون کیلی کو قومی سلامتی کا وزیر مقرر کیا۔

اولاد اور خاندان

جنرل جان کیلی نے ۱۹۷۶ء میں کیرن ہیرنسٹ سے شادی کی، جس سے ان کے تین بچے ہوئے۔ایک بیٹا افغانستان میں مارا گیا، جبکہ دوسرے دو بچے جون اور بیٹی کیتھلین امریکا میں ہیں۔

۲۰۱۰ء میں جون کیلی کا بیٹا رابرٹ افغانستان میں تعینات کیا گیا۔ افغانستان میں سانحین کے مقام پر ایک بارودی سرنگ کے دھماکے میں وہ ۲۹ سال کی عمر میں ہلاک ہو گیا۔وہ اس کا بیرون ملک فوجی افسر کی حیثیت سے پہلا مشن تھا۔

داخلی سلامتی کا وزیر

امریکا کی وفاقی حکومت میں داخلی سلامتی کے وزیر کو اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔اس کی اہم ترین ذمہ داریوں میں ملک کا دفاع اور سلامتی کو یقینی بنانے کے اقدامات، دہشت گردی کی کارروائیوں کی روک تھام اور حادثات و آفات کی صورت میں ہنگامی طور پر نمٹنا شامل ہوتا ہے۔وزارتِ دفاع فوج کی آپریشنل کارروائیوں اور بیرون ملک سلامتی کے امور پر توجہ دیتا ہے جب کہ داخلی سلامتی کے وزیر کی ذمہ داری امریکا کے اندر شہریوں کا ہر ممکن تحفظ کرنا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مشورہ

دہشت گردی کے خلاف جنگ برسوں سے جاری ہے اور لگتا ہے کہ یہ ناسور آنے والی نسلوں میں بھی موجود رہے گا۔امریکا ویسے بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کا عادی ہے۔عراق اور افغانستان اس کی زندہ مثالیں ہیں۔داخلی سلامتی کے وزیر کا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مشورہ بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔امریکا کا دعویٰ ہے کہ نائن الیون کے سانحے کے بعد بھی امریکا میں دہشت گردی کا خطرہ ٹلا نہیں۔

پناہ گزینوں سے متعلق رائے

امریکا میں داخلی سلامتی کے وزیر کی اہم ذمہ داری پناہ گزینوں کی آمد و رفت اور امیگریشن کے امور پر نظر رکھنا ہے۔ جون کیلی اس باب میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے انہیں اس عہدے کے لیے چنا ہے۔

جون کیلی گوانتاناموبیل کو بند کرنے کے بھی حامی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیرون ملک کارروائیوں میں حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۳

سچائی نہیں، جھوٹ کی دنیا

رابرٹ فسک

ہم سچائی کی دنیا میں نہیں جی رہے۔ نہ تو مشرق وسطیٰ میں، نہ مغرب میں اور نہ ہی روس میں۔ ہم جھوٹ کی دنیا میں آباد ہیں۔ اور ہم ہمیشہ سے جھوٹ کی دنیا ہی میں رہتے آئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی تباہی اور اس کے قابلِ نفرت آمروں کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ وہ سب بدعنوانی کے بل بوتے پر پروان چڑھے تھے اور معمر قذافی کے سوا تمام کے تمام اپنے اقتدار کا جواز پیش کرنے کے لیے انتخابات کا ڈھونگ رچاتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ کچھ تو جمہوری حکمران ہونے کے بھی دعویدار تھے۔

اب میرا خیال ہے کہ ہم بھی جھوٹ کی بنیاد پر باقاعدہ انتخابات کرانے کے ماہر ہو چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم آنے والے دنوں میں ٹرمپ اور عرب دنیا کے آمروں کے درمیان گاڑھی چھنتی دیکھیں۔ ٹرمپ مصر کے صدر فیلڈ مارشل عبدالفتاح السیسی کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹرمپ دبئی میں گولف کورٹ بنا چکے ہیں۔ اُن کی جھوٹ کی صنعت کی پیداوار سچے حقائق ہیں، چنانچہ وہ مشرق وسطیٰ کے کافی قریب ہوں گے۔ عرب دنیا کے نمایاں خدوخال خواتین سے نفرت، سیاسی مخالفین کو کچلنا، آمریت، جبر، تشدد، اقلیتوں کی توہین وغیرہ ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ڈونلڈ ٹرمپ ان باتوں سے پریشان ہوں گے۔ اسرائیل کی طرف دیکھیں۔ امریکا کے اسرائیل کے لیے متوقع سفارت کار امریکی سفارت خانہ یروشلم منتقل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ٹرمپ فلسطینیوں کے مقابلے میں امریکا میں بسے ہوئے بائیں بازو کے یہودیوں سے زیادہ مخاصمانہ رویہ رکھتے ہوں۔ تو کیا ٹرمپ عربوں کو مشتعل کریں گے؟ یا وہ داخلی طور پر اسرائیلی سفارت خانے کا ایسا انتظام کر کے مطمئن ہو جائیں گے کہ خلیج کے عربوں کو کم از کم اتنا تو یقین ہو کہ اسرائیل شام، ایران اور حزب اللہ کا مخالف ہے۔

جہاں تک انتہا پسندوں، جہادیوں اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا تعلق ہے تو فی الحال اُنہیں بھول جائیں اور مت پوچھیں کہ یہ لوگ اب ان کے خلاف کیوں صف آرا ہیں؟ عوام کا کیا ہے، اُنہیں بہرطور یقین دلا دیا جائے گا۔

مجھے شک ہے کہ سچ کے بعد کی دنیا میں مکروفریب سے بھرپور انتخابات کی بجائے سوشل میڈیا کا زیادہ عمل دخل ہوگا۔ مشرقی حلب کی جنگ کی رپورٹنگ میں سوشل میڈیا ہی غیر معمولی طور پر ''جنگی، خونی، خطرناک، عجیب اور ہلاکت خیز'' تھا، جبکہ ایک بھی مغربی صحافی مشرقی حلب کے محاذ پر موجود نہ تھا۔ اس غفلت نے صحافت، اور کسی حد تک سیاست دانوں، کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہمیں یک طرفہ کہانی سننا اور ماننا پڑی۔ اُس جنگ کی کوریج میں کسی صحافی کا کوئی کردار نہیں۔ سب کچھ سوشل میڈیا کے ذریعے ہی ہم تک پہنچا۔ ہم نے صحافت کو سوشل میڈیا کے حوالے کر دیا اور سوشل میڈیا اُس خطے سے اپنا پیغام پھیلا رہا تھا، جو مسلح افراد کے کنٹرول میں تھا۔ تو کیا اگلی جنگیں بھی اسی ''منصوبہ بندی'' کے ساتھ لڑی جائیں گی؟ کیا سوشل میڈیا ہاتھ آئی سچائی کو آئندہ صحافت کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے گا؟ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہو سکے گا۔ اب وہ اِدلب جائیں گے۔ اس خطے کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ باقی شامی صوبوں کی نسبت غیر معمولی حد تک بڑا ہے، چنانچہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تمام مشرق وسطیٰ میں حقائق کو من پسند انداز کی ملمع کاری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ مشرقی حلب میں ڈھائی لاکھ افراد پھنس کر رہ گئے ہیں اور اب ۳۱ ہزار اِدلب جانے کو تیار ہیں۔ دوسرے بہت سے لوگوں کا رخ مغربی حلب کی طرف ہے اور ان کی تعداد ۹۰ ہزار سے کم نہیں۔ ان تمام افراد کو نکلنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ یہ اعداد و شمار سب سے پہلے کس نے سوشل میڈیا پر پھینکے تھے۔ نہ ہی کوئی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اب جبکہ وہاں داعش واپس آ چکی تو تدمر میں کتنے شہری موجود ہیں؟ اور پھر موصل سے کیا خبریں آ رہی ہیں؟ دس لاکھ سے زائد گھرے ہوئے شہریوں کو بچانے کے حوالے سے کیا کیا جا رہا ہے؟

اب امریکیوں کا کہنا ہے کہ عراقی فورسز عراق کے دوسرے بڑے شہر کے گرد خود کو دوبارہ منظم کرتے ہوئے پوزیشن سنبھال رہی ہیں۔ ڈنکرک (Dunkirk) سے پسپائی کے وقت برطانوی فورسز نے بھی یہی حکمت عملی اپنائی تھی۔ ہم ٹرمپ یا بریگزٹ کے بلند آہنگ نقیبوں کی دروغ گوئی پر کیا شکایت کریں، جب ہم صحافی خود مشرق وسطیٰ کے حقائق کا قیمہ بنا کر پیش کر رہے ہیں؟ ابھی تک ہمارے اخبارات اور ٹیلی وژن اسرائیلی کی دیوار کو ''سیکیورٹی فینس'' اور اس کے غاصبانہ قبضے کو ''نئی بستیاں'' قرار دیتے ہیں۔ کیا ہم سیاست دانوں کی طرف سے انتخابات کے مواقع پر بولے گئے جھوٹ پر افسوس کر سکتے ہیں جبکہ ہم خود اپنے قارئین اور ناظرین سے اتنا جھوٹ بولتے رہے ہوں؟ میرے پسندیدہ صحافی اور فلاسفر، فنٹان اوٹولے ہیں جو ''دی آئرش ٹائمز'' کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ اس ماہ انہوں نے ایک عمدہ بات کہی کہ ۲۰۱۶ء کی سیاست میں دروغ گوئی حیرت انگیز طور پر موثر رہی۔ بریگزٹ ریفرنڈم کے موقع پر جھوٹ بولا جاتا رہا کہ یورپی یونین سے نکلنے کی صورت میں ہونے والی بچت ۳۵۰ ملین پاؤنڈ فی ہفتہ کو نیشنل ہیلتھ سروس پر خرچ کیا جائے گا، لیکن بہت جلد اس جھوٹ کا پردہ چاک ہو گیا۔ پھر بھی جھوٹ کا شکار ہونے والوں کو اس سے کچھ فرق نہ پڑا۔ اوٹولے کا کہنا ہے کہ جھوٹ بہت تیزی اور آزادی سے سفر کرتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اسے ثبوتوں کی بیساکھیاں درکار نہیں ہوتیں۔ نازی فورسز کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام یعنی ہولوکاسٹ کو اب سوشل میڈیا پر بے بنیاد کہانی قرار دیا جاتا ہے۔ ''باخبر'' قاری اسے نیو نازی پروپیگنڈا قرار دے کر کاندھے جھٹکتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کسی بھی کمپنی یا سرکاری ادارے پر کوئی الزام عائد کیجیے تو وہ ''سوچ کے فرق'' کی دلیل لے آتا ہے۔ اب معاشرے کو نقصان پہنچانے والے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ ''ہولوکاسٹ نامی واقعہ کبھی رونما ہی نہیں ہوا''۔

میری یادداشت ساتھ نہیں دے رہی کہ میں نے اس سے زیادہ طنزیہ الفاظ کہاں سنے تھے؟ اس کے بعد جب میں اتفاقاً، پولینڈ میں تھا، مارٹن جیرٹ کا ''جرمن عقوبت خانوں کے بارے میں جھوٹ'' اور امریکا اور برطانیہ کی جرمن عقوبت خانوں کو بند کرانے کے لیے فوجی کارروائی کی ناکامی کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں میں نے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کے ایڈوولف ہٹلر کے یہ الفاظ پڑھے تھے ''جرمنی میں تو کبھی یہودی بھی میری پیش گوئیوں پر ہنستے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اب بھی کہیں مسکرا رہے ہوں گے یا نہیں۔ کیا اب اُن کے قہقہوں کا جذبہ سرد پڑ چکا ہے؟'' ۱۹۲۵ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد ہٹلر نے "Volkischer Beobachte" میں ایک مضمون لکھا اور اس میں یہودیوں، مارکسی اور ویمر نظریات رکھنے والوں پر سخت نکتہ چینی کی۔

کسی بھی عصبیلے شخص کے لیے توہین آمیز الفاظ برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یقیناً فراتیج نازی یا ٹرمپ نہیں۔

یورپ کے دائیں بازو کے سیاست دان ہمیں نسل پرستی سے مسلسل خائف بھی نہیں رکھتے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت سب سے خوفناک چیز سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا ہے۔ یہ سوچ بھی ایک طرح کی فسطائیت ہے کہ ہم خود فیصلہ کر رہے ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ آج ہمیں خبر جاری کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا ہے۔ یہ اِس دور کا نشہ ہے۔ ''سوچ کا فرق'' ایک کارگر فارمولا بن کر ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اب کسی بھی سچ یا جھوٹ کو چھپانا ایسا آسان نہیں رہا۔ معمولی سا رپورٹر بھی دیکھ سکتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اب سے پہلے ناظرین کی بھی اتنی تعداد نہ تھی۔ اب ناظرین خود فیصلہ کرتے ہیں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود جھوٹ کا بازار گرم ہے۔

آج آپ صرف تاریخ ہی کو نہیں جھٹلاتے، بہت سے جھوٹ تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے مشرق وسطیٰ میں ہمارے صحافتی تعاون سے دروغ گوئی کی صنعت پروان چڑھ رہی ہے۔ آج ہر آمر دہشت گردی کے خلاف لڑ رہا ہے۔ امریکا، نیٹو، ایران، روس، حزب اللہ اور خلیج کے تمام آمر ایک صف میں کھڑے دہشت گردی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ کچھ شرمناک وجوہ کی بنیاد پر یمن کو اس فہرست میں شامل کرنے سے گریزاں ہوں۔ اس دوران چین، جاپان، آسٹریلیا اور گرین لینڈ کیا کر رہے ہیں؟ دستر خوان بچھا ہوا ہے مگر اس پر انصاف نام کا پکوان نہیں۔ بہت کم سیاست دان، صحافی اور سفارت کار اس کے ذائقے سے آشنا ہیں۔ کچھ نے یہ لفظ کبھی سنا ہی نہیں۔ نہ تو ٹرمپ اور نہ ہی کلنٹن یا بریگزٹ کے حامی انصاف کی بات زبان پر لانے کے روادار ہیں۔ میں یہاں دہشت گردی کا شکار ہونے والے افراد کو انصاف دلانے کی بات نہیں کر رہا بلکہ برطانوی ووٹروں کی بات کر رہا ہوں، جن سے یورپی یونین سے نکلنے کے فوائد کی بابت جھوٹ بولا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ سال سیاسی دنیا میں آنے والے بھونچال نے ہمیں جھوٹ کو دہرانے پر ندامت کی اذیت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ جنگ میں جھوٹ ایک معمول کی بات بن جاتا ہے اور اسے محاذ کی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ آج کی دنیا ایک ایسا محاذ بن چکی ہے جہاں جھوٹ کی تصدیق کے بھی پیمانے موجود ہیں۔ جہاں موجود نہ ہوں، وہاں وضع کر لیے جاتے ہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"We are not living in a 'post-truth' world, we are living the lies of others".

("independent". December 29, 2016)

سعودی عرب کی ٹرمپ سے توقعات

Gerald M.ferierstein

دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح سعودی عرب بھی بے چینی سے ٹرمپ انتظامیہ کی مشرق وسطیٰ کی پالیسی کی سمت واضح ہونے کا انتظار کر رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ سعودیہ نے اوباما کی صدارت کے خاتمے کا خیر مقدم کیا ہے، اپنے دورِ صدارت میں اوباما نے سعودی حکومت کی مایوسی میں دن بدن اضافہ کیا تھا، اسی لیے انہوں نے واشنگٹن میں نئی انتظامیہ کی آمد کو خوش آمدید کہا۔ ۹ نومبر کو سعودی شاہ سلمان نے ٹرمپ کو کامیابی پر مبارکباد کا خیر مقدمی پیغام بھیجا، شاہ سلمان نے پیغام دیا کہ ''آپ کے مشن کی کامیابی ہی دنیا اور خصوصاً مشرق وسطیٰ میں سلامتی اور استحکام کی ضمانت ہے''۔ ٹرمپ کی جانب سے اپنی انتخابی مہم میں دیے گئے بیانات کی وجہ سے سعودی یقین رکھتے ہیں کہ نئی امریکی انتظامیہ کی آمد کے ساتھ امریکا اور سعودیہ کے تعلقات بہت بہتر ہو جائیں گے۔ سعودی عرب یقینی طور پر خطے میں ایران کے خلاف امریکا کے ہر اقدام کی حمایت کرے گا۔ اوباما کے دورِ صدارت میں مشرق وسطیٰ میں ایران کی مداخلت اور امریکا اور ایران کے بہتر تعلقات نے سعودیہ کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی لیے سعودی شہزادے ترکی الفیصل نے مطالبہ کیا ہے کہ ایران کے ساتھ ہونے والا جوہری معاہدہ ختم کر دیا جائے۔ ایران پر دباؤ ڈالنے کے ساتھ سعودی عرب کی یقینی طور پر کوشش ہوگی کہ خطہ مزید عدم استحکام کا شکار نہ ہو، مصر اور سعودی عرب کے درمیان اختلافات کے باوجود ٹرمپ کی طرف سے جنرل سیسی کی حکومت کو گلے لگانے کے فیصلے سے بھی سعودیہ خوش ہے۔

سعودی عرب سنی دنیا اور امریکا کے درمیان وسیع تعلقات کا خواہشمند ہے، ان تعلقات کی بنیاد صرف عالمی دہشت گردی اور تشدد کے خلاف جنگ ہو، نہ کہ جمہوریت، انسانی حقوق اور شہری آزادی کے خلاف۔ امریکا کی نئی انتظامیہ کے کچھ اقدامات سعودی عرب کے لیے مشکلات کا سبب بھی بن سکتے ہیں، صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے مشرق وسطیٰ میں روسی پالیسی کی حمایت کا فیصلہ سعودی عرب کے لیے بُری خبر ہوگی۔ سعودی عرب کی نظر میں اسد حکومت کا قائم رہنا ایران کے لیے ایک تحفہ ہوگا، جو مشرق وسطیٰ میں ایرانی گرفت مزید مضبوط کرے گا۔ شام میں اسد حکومت کو مضبوط اور حزب اختلاف کو کمزور کرنے پر سعودی عرب کو شدید پریشانی لاحق ہوگی۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران ٹرمپ نے سعودی عرب کو امریکا کی جانب سے دی جانے والی دفاعی سہولیات کے بدلے اربوں ڈالر لینے کا مطالبہ کیا تھا، جو غیر حقیقی تھا۔ کیونکہ سعودی عرب، امریکا اور چین کے بعد دنیا میں سب زیادہ رقم اپنے دفاع پر خرچ کر رہا ہے، بہرحال نئے امریکی وزیر دفاع جنرل جیمز میٹس سعودی اور امریکا کے دفاعی تعلقات کی باریکیوں کو سمجھتے ہیں، ایک اور مشکل ٹرمپ کے کیمپ کی جانب سے سعودی سلفی مسلک کو القاعدہ اور دولت اسلامیہ سے جوڑنا بھی ہے، اگر امریکا میں سعودیوں کے خلاف بیان بازی کی مہم جاری رہتی ہے تو یہ ۳۵ ہزار سعودی طلبہ کے مستقبل کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ مگر سعودیوں کو امید ہے کہ مستقبل میں یہ مسئلہ پس منظر میں چلا جائے گا کیونکہ ٹرمپ انتظامیہ کی زیادہ توجہ امریکا کے اندرونی معاملات بہتر کرنے پر ہوگی، سابق صدر اوباما کی طرف سے ویٹو کیا گیا دہشت گردی سے متعلق ایکٹ سعودی عرب اور امریکا کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ ہے، سعودی عرب یہ جاننا چاہے گا کہ مستقبل میں ٹرمپ کی اس ایکٹ کے حوالے سے کیا حکمت عملی ہوگی؟ ٹرمپ اس قانون کو ختم یا اس میں ترمیم کر دیں گے۔ انتخابی مہم کے دوران ری پبلکن پارٹی نے صدر اوباما کے ایکٹ کو ویٹو کرنے کی مخالفت کی تھی مگر ٹرمپ کا موقف اس ایکٹ کے حوالے سے واضح نہیں ہے، ہوسکتا ہے صدر ٹرمپ ایک کاروباری ہونے کی وجہ سے ''جسٹا'' ایکٹ کو امریکا اور سعودیہ کے تعلقات کے لیے مناسب نہ سمجھتے ہوں، مگر صدر ٹرمپ اسلامی انتہا پسندی کے خلاف سخت موقف کی وجہ سے اس ایکٹ کو بحال بھی کر سکتے ہیں، جو سعودی عرب کے لیے بڑا مسئلہ ہوگا۔ ٹرمپ نے ماحولیاتی تحفظ کے اقدامات ختم کرنے کے ساتھ امریکا میں مقامی تیل اور گیس کی پیداوار بڑھانے کا اعلان کیا ہے، ٹرمپ کے اس اقدام سے عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں میں کمی ہوگی جو سعودی عرب کی معیشت کو متاثر کرے گی۔ بہرحال سعودی عرب انتظار کر رہا ہے کہ ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کیا رخ اختیار کرتی ہے اور بیانات میں کتنی حقیقت ہے۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

("What the Saudi Monarchy wants from the US". ("real clear world .com". Jan. 24, 2017)

متبادل سچ

افضل رحمان

آج کل ''انیس سو چوراسی'' (۱۹۸۴ء) نام کے معروف انگریزی ناول کی ایک مرتبہ پھر دھوم مچی ہوئی ہے۔ Amazon.com والوں کا کہنا ہے کہ اس ناول کی مانگ اچانک اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بار بار اس کی نقول چھاپنی پڑ رہی ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ مبصرین یہ بتا رہے ہیں کہ امریکا میں ڈونلڈ ٹرمپ نے جس انداز سے حکمرانی کرنے کا عندیہ دیا ہے اور جس پر عمل پیرا بھی ہو چکے ہیں، اس کی ایک جھلک ۱۹۸۴ء کے اس ناول میں ملتی ہے۔

''انیس سو چوراسی'' اور کمیونسٹوں کے خلاف معروف ناول "Animal Farm" کے لکھنے والے George Orvell ہیں۔ جارج آرول موصوف کا قلمی نام ہے، اصل نام شاید Eric Blair تھا، جو کم ہی کسی کو معلوم ہے۔ یہ نام صرف موصوف کی قبر کے کتبے پر موجود ہے، اس پر جارج آرویل نام موجود نہیں ہے۔

۱۹۸۴ء نام کے ناول میں مصنف نے یہ تصور کیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں تین سلطنتیں قائم ہوگئی ہیں۔ سوویت یونین نے برطانیہ کے سوا باقی سارا یورپ فتح کر لیا ہے اور برطانیہ پر امریکا نے قبضہ کر کے Oceania کے نام سے ایک بڑی سلطنت قائم کی ہے، جس میں برطانیہ کا نام Alrstrip one ہے۔ ایک تیسری شہری سلطنت ایشیا میں قائم ہے اور یہ تینوں سلطنتیں ایک دوسرے سے محاذ آراء رہتی ہیں۔

امریکا والی جو سپر اسٹیٹ Oceania ہے اس کو ایک آمریت نما حکومت چلا رہی ہے، جو اپنے آپ کو انگلش سوشلزم (English Socialism) پر کاربند کہتی ہے۔ Newspeak کے نام سے ایک نئی زبان بنا رکھی ہے۔ Big Brother کے نام سے ایک حکمران ہے اور Inner Party کے نام سے ایک مختصر سا گروپ حکومت چلا رہا ہے۔ یہ پوری آبادی کا ۲ فیصد ہے۔ Outer Party کے نام سے مڈل کلاس ہے، جو کُل آبادی کا ۱۳ فیصد ہے۔ باقی غیر تعلیم یافتہ ورکنگ کلاس ہے، جو آبادی کا ۸۵ فیصد ہے۔ آبادی پر اس قدر سخت کنٹرول ہے کہ ہر جگہ کیمرے لگے ہیں، جاسوسی کے جال بچھے ہیں۔ جگہ جگہ لکھا ملتا ہے:

Big Brother is Watching you

Oceania نام کی اس سپر اسٹیٹ نے چار وزارتیں قائم کر رکھی ہیں۔ پہلی وزارت ''امن'' ہے لیکن کام اس کا ہے ''جنگ'' اور ''دفاع کرنا''۔ دوسری وزارت ہے Ministry of Plenty جس کا کام تو ہونا چاہیے کہ وہ اشیاء وافر مقدار میں عوام کو فراہم کرے گی مگر یہ وزارت دراصل ہر شے کی راشننگ کرتی ہے۔ تیسری وزارت ''محبت'' کی وزارت ہے، Ministry of love مگر کام ہے نظم و نسق، جواذیت رسانی اور برین واشنگ سے کیا جاتا ہے۔ چوتھی وزارت ہے Ministry of Truth یعنی سچ کی وزارت، مگر کام ہے پروپیگنڈا، پرانی تاریخ کو تبدیل کرنا۔ اس ناول کا مرکزی کردار ونسٹن اسمتھ (Winsten Smith) ہے۔ اس کا کام یہی ہے کہ وہ تاریخی ریکارڈ کو بدل کر پارٹی لائن کے مطابق بناتا رہے۔

آگے یہ پورا ناول ہے جس کو شوق ہو، وہ پڑھ سکتا ہے۔ آج کل انٹرنیٹ کے دور میں ان چیزوں کا حصول انتہائی آسان ہے؛ تاہم میں نے جو چیدہ چیدہ نکات تحریر کیے ہیں، ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے آتے ہی اس ناول کی مانگ میں اچانک اضافہ کیوں ہوا ہے۔

امریکی معاشرے میں اس مرتبہ کے صدارتی انتخاب اور اس کے نتائج نے ایسی ہلچل مچا دی ہے کہ وہاں اس وقت تک کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا ہونے جا رہا ہے' کیا ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کے قلیل المیعاد نتائج کیا ہوں گے اور طویل المیعاد نتائج کیا ہوں گے؟ صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ میری اصل اپوزیشن ڈیموکریٹک پارٹی نہیں بلکہ امریکا کا میڈیا ہے۔ میڈیا کے خلاف جنگ کا ماحول بنا ہوا ہے۔ ٹرمپ کے تحت وائٹ ہاؤس کا یہ عالم ہے کہ پوری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ اوباما کی حلف برداری میں آنے والوں کی تعداد ٹرمپ کی حلف برداری کے موقع پر موجود لوگوں سے زیادہ تھی۔ تصویری شہادت بھی موجود ہے مگر وائٹ ہاؤس کی ایک ترجمان خاتون کا کہنا ہے کہ وائٹ ہاؤس کے ترجمان جب یہ کہتے ہیں کہ ٹرمپ کی حلف برداری میں اوباما کی حلف برداری سے زیادہ لوگ تھے تو وہ عوام کے سامنے متبادل سچائی پیش کر رہے ہیں۔۔ Alternate Truth۔ آپ سوچیں، سچائی تو ایک ہی ہوتی ہے، اب متبادل سچائی آ گئی تو لامحالہ لوگوں کا دھیان جارج آرویل کے ناول ۱۹۸۴ء کے طرزِ حکمرانی کی طرف جاتا ہے، جس میں Newspeak کے نام سے نئی زبان بنائی جاتی ہے۔

ٹرمپ کا ذکر کافی ہو گیا۔ تھوڑا بیان جارج آرویل کا بھی ہو جائے۔ موصوف نے ۱۹۸۴ء کے نام سے ناول ۱۹۴۹ء میں لکھا تھا اور ۱۹۵۰ء میں جارج آرویل کا انتقال ہو گیا تھا۔ گویا اس ناول کی بعد ازاں جس قدر پذیرائی ہوئی، جس سے موصوف بے خبر ہی رہے۔ اس سے پہلے جو معرکہ آرا ناول Animal Farm لکھا وہ اشتراکیت کے خلاف تھا۔ اس کو کوئی شائع کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے یہ ناول تحریر کیا تھا اور اس زمانے میں سوویت یونین اتحادیوں میں شامل تھا، لہٰذا خدشہ تھا کہ کمیونزم کے خلاف کوئی تحریر سوویت یونین کی حکومت کو ناراض کر سکتی ہے۔ جارج بے چارہ اس ناول کا مسودہ اٹھائے اٹھائے پھرتا رہا۔ اب یہ دونوں ناول یعنی "Animal Farm" اور ''۱۹۸۴ء'' انگریزی زبان کے معرکہ آرا ناول شمار ہوتے ہیں اور اگر ان کے مصنف کی زندگی پر نظر ڈالیں تو بیچارے پر ترس آتا ہے۔

جارج آرویل بھارت کی ریاست بہار میں پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے والد افیون کی کاشت کے کسی سرکاری پروگرام سے وابستہ تھے۔ چھوٹی عمر میں ماں اسے برطانیہ لے گئی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر پولیس میں بھرتی ہو کر برما آ گیا۔ وہاں پتا نہیں کیا ہوا کہ واپس برطانیہ چلا گیا۔ اسپین میں سول وار شروع ہوئی تو موصوف اس میں حصہ لینے چلے گئے۔ قد لمبا تھا، ساتھی منع کرتے تھے کہ مورچوں میں کھڑا نہ ہوا کرے مگر باز نہ آئے اور ایک روز ایک گولی آ کر گلے میں لگی۔ شہ رگ بچ گئی اور خود بھی بچ گئے۔ اس وجہ سے دوسری جنگ عظیم میں شرکت کے لیے غیر موزوں قرار دیے گئے۔ پھر کچھ عرصہ پڑھاتے رہے۔ صحافت بھی کی' بی بی سی پر بھی کام کرتے رہے۔ پوری زندگی لکھتے بھی رہے مگر عمر کے آخری حصے میں لکھے گئے دو ناولوں کے علاوہ کچھ ریکارڈ پر نہیں ہے۔ بدقسمتی دیکھیے کہ بی بی سی کی نشریات میں شریک رہے مگر موصوف کی آواز تک بی بی سی کے پاس محفوظ نہیں ہے۔

تپ دق کے مرض میں مبتلا تھے اور ایک سینی ٹوریم میں وفات پائی۔ موصوف کی عمر سعادت حسن منٹو مرحوم کی طرح پچاس برس سے بھی کم تھی۔ اتنی کم عمری میں اتنا کچھ کر کے نقشِ دوام چھوڑ گئے۔ آج ہمارا ادیب اگر جارج آرویل یا منٹو کے مقابلے پر نکلے تو اسے ٹرمپ کے وائٹ ہاؤس کی طرح ایک متبادل سچ (Alternate Truth) کی ضرورت پڑے گی۔

(بشکریہ: روزنامہ ''دنیا'' کراچی ۔ ۳۱ جنوری ۲۰۱۷ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950